ادبِ لطیف

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر نمبر ۵۴/۵۰۰۶ ۵۳ مورخہ ۵ راکتوبر ۱۹۵۴ء
۲۷۷۶۷۹ مورخہ ۲ راکتوبر ۱۹۵۴ء .... بموجب سرکلر نمبر ۱۵۴ مورخہ ۲۲ راپریل

بانی چودھری برکت علی مرحوم

ادبِ لطیف لاہور

ستمبر ۱۹۶۱ء

مینجنگ ایڈیٹر:۔
افتخار علی چودھری

مرتب:۔
میرزا ادیب

زرِ سالانہ:۔ دس روپے
فی پرچہ ۷۵ پیسے
غیر ممالک میں:۔ بارہ روپے

مکتبہ ادبِ لطیف، لاہور

افتخار علی چودھری نے اُردو پریس میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر "ادبِ لطیف" سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔

فہرس

پیرایۂ آغاز

آجکل اُردو میں بہت کم ایسے افسانے پڑھنے کے لیے ملتے ہیں جنھیں بلند افسانوی تخلیقات کہہ سکیں۔ اس کی بنیادی وجہ صرف یہی سمجھی جاتی ہے کہ ہمارے اعلیٰ پایے کے افسانہ نگاروں نے یا تو فن سے تساہل کیشی اختیار کر لی ہے یا اپنی صلاحیتوں کو اور قسم کی مصروفیتوں کی نذر کر دیا ہے۔ یہ وجہ اپنی جگہ درست ہی معلوم ہوتی ہے مگر اسے بنیادی وجہ سمجھنا شاید مناسب نہ ہوگا۔ اگر اس معاملے کو پوری طرح پرکھا جائے تو ہمارے سامنے کئی ایسے وجوہ آجائیں گے جن پر غور و تامل کرنا ہمارا فرض ہوگا۔ دوسرے وجوہ کو چھوڑیئے۔ صرف اس ایک وجہ کو سامنے لے آیئے کہ ہمارے ناشر اردو افسانوں کی اشاعت میں اس دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہے جو ایک صنف کی ترقی و فروغ کے لیے بہت ضروری ہے اور جسے اگر ختم کر دیا جائے تو لازماً متعلقہ صنف پر بھی ناخوشگوار اثر پڑ سکتا ہے اور مسلسل پڑتا رہتا ہے۔ یہ درست کہ موجودہ دور میں سب سے زیادہ جس چیز کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ ناول ہے۔ مگر جس وقت رسائل و جرائد پر نظر ڈالی جاتی ہے اور پڑھنے والوں کے مجموعی مطالبے کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پڑھنے والے آج بھی باقی اصنافِ ادب کے مقابلے میں افسانے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور عموماً سب سے پہلے اسی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اگر قارئین رسالوں میں افسانوں کو اتنی دلچسپی سے پڑھتے ہیں تو پھر انھیں کتابی صورت میں ذوق و شوق کے ساتھ کیوں نہیں قبول کریں گے!؟

گذشتہ دو سال کی مدت میں اتنے افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں کہ اگر انھیں اس دوران شائع ہونے والے ناولوں کے ڈھیر میں پھینکا جائے تو ان کا وجود ہی کالعدم، ہو جائے گا!

یہ صورتِ حال سخت افسوس ناک ہے۔

یاد رہے کہ ہم نے صرف ایک ہی وجہ پر روشنی ڈالی ہے۔ باقی وجوہ کی طرف توجہ نہیں کی!

اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگار اب اپنے فن کے معاملے میں تغافل برت رہے ہیں۔۔۔ یہ حقیقت تکلیف دہ ہے مگر اس کے ساتھ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں نئے افسانہ نگاروں کا برابر اضافہ ہو رہا ہے تو اس مایوسی میں کسی نہ کسی حد تک کمی ضرور آجاتی ہے۔

ادبِ لطیف کے اس نمبر میں دیکھیے۔۔۔ دو نام بالکل نئے ہیں۔۔۔ افضال ثانی اور رشید امجد

افضال ثانی کا افسانہ ایک حادثہ۔۔۔ ابھی محض ایک حادثہ ہے۔ مگر توقع کرنی چاہیے کہ وہ آئندہ حادثات کی بجائے زندگی کی گہری حقیقتوں کی طرف توجہ کرنا زیادہ ضروری سمجھیں گے۔ بہر حال یہ حادثہ بھی کوئی سطحی شے نہیں بلکہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ ہماری معاشرت کے ایک خاص پہلو کی نشان دہی کر رہا ہے۔

اس نئے افسانہ نگار کے ہاں جو عنصر ہمیں خاص طور پر ملتا ہے وہ ان کا اختصار گوئی کا رجحان ہے۔ یہی چیز آگے بڑھ کر جب ان کا مشاہدہ گہرا ہو جائے گا، بہت مفید ثابت ہو گی!

رشید امجد کے افسانے کا مرکزی خیال کسی چینی افسانے سے ماخوذ ہے۔ تاہم ایک مرکزی خیال کے گرد انھوں نے واقعات کو جس انداز سے پھیلا دیا ہے وہ ان کی سوجھ بوجھ کا واضح طور پر اظہار کر رہا ہے اور ہمیں یقین دلاتا ہے کہ وہ کچھ مدت کے بعد اچھے طبع زاد افسانے لکھنے لگیں گے!

اُردو — تیرا نام عبدالحق بھی ہے

مولوی عبدالحق کی موت اگر ایک فرد کی موت ہوتی تو اتنا بڑا قومی حادثہ نہ ہوتا مگر بابائے اردو کی موت تو ایک ادارے کی موت ہے۔ ایک ایسے ادارے کی موت جو کم و بیش پچھتر برس تک شب و روز مصروفِ عمل رہا ہے۔

ایسا فرد صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے جو فرد ہوتے ہوئے بھی ایک ادارہ بن جاتا ہے۔ اور مولوی عبدالحق ایک ایسے ہی فرد تھے۔

مولوی عبدالحق صرف ایک ادارہ ہی نہیں تھے اور بھی بہت کچھ تھے۔

وہ اس محفل کی آخری شمع تھے جو سرسید، شبلی اور حالی کی جلوہ سامانیوں سے مستفید ہو چکی تھی۔

وہ عملی تفسیر تھے اس وضعداری کے جو ہمارے بزرگوں نے ایک روایت کے طور پر چھوڑی تھی۔

اور پھر وہ عبارت تھے اس جذبہ ایثار سے جو روز بروز اپنی قدر و قیمت سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس دنیا میں لوگ مذہب پر بھی قربان ہوتے رہے ہیں — قربان گاہِ سیاست پر بھی جانوں کے نذرانے پیش ہوتے رہے ہیں۔ اور ہر دور میں ایسے لوگ بھی موجود رہے ہیں جو وطن کی خاطر مرمٹتے رہے ہیں — مگر اپنی ساری زندگی کو صرف ایک زبان کے لیے وقف کر دینا ایک ایسا واقعہ ہے جس سے ایثار پیشگی کی تاریخ بہت کم آشنا رہی ہے۔

مولوی عبدالحق کا دوسرا نام اردو بھی ہے۔ اردو کی زندگی، اردو کی ترقی اور اُردو کے فروغ کے لیے اپنا سب کچھ تج دینا — کوئی معمولی بات نہیں ہے — ایک ایسی بات ہے جو مولوی صاحب کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ہے۔

مولوی صاحب کی کس کس خوبی کو گنوایا جائے — وہ مجسّم ایثار تو تھے ہی۔ اس کے علاوہ جرأت و دلیری میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ صداقت شعاری اور راست گوئی کی خاطر مرحوم برِصغیر کی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی ٹکرا گئے اور ان کے قدموں میں ذرہ برابر بھی لغزش نہ آئی۔ اصول کی شکست کو تو وہ اپنی زندگی کی شکست سمجھتے تھے اور ان کی زندگی پر شکست نے سایہ تک بھی نہ ڈالا تھا۔

بڑے بوڑھوں کی طرح اپنے خول میں بند ہونا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ ہر قدم پر انھوں نے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا تھا۔ ادب کی ترقی پسند تحریک اٹھی تو انھوں نے لبیک کہا۔ گلڈ معرضِ وجود میں آئی تو وہ اس کے بھی بنیادی رکن بن گئے۔

مولوی عبدالحق بہرصورت ایک انسان تھے — اور ہر انسان آخر کار فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے — مگر اُردو جس کا دوسرا نام عبدالحق بھی ہے۔ آج بھی زندہ ہے — اور زندہ رہے گی!

آئندہ شمارے کا ایک حصہ عبدالحق مرحوم کے لیے وقف ہو گا!

افکار و مسائل

امریکی مطبوعات (۳)

ادبِ لطیف کے پچھلے دو شماروں میں امریکی مطبوعات کے متعلق کچھ معروضات پیش کی گئی تھیں۔ ان معروضات کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ لوگ جو اہلِ علم ہیں اور جنھیں ملک کی ادبی و تہذیبی زندگی سے دلچسپی ہے، وہ اس طرف فوری توجہ کریں۔ اور یہ آواز۔ جو یقیناً ایک نہایت معمولی آواز ہے۔ اگر سچائی کی اساس پر بلند ہوئی ہے تو پھر اسے اس لمحۂ فکریہ سے محروم نہ کریں جس کی یہ جائز طور پر مستحق ہے۔ اس شمارے میں پڑھنے والوں کے چند خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے واضح انداز میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔ بعض اہلِ فکر نے اِدھر خصوصی توجہ کی ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کی پوری پوری ہمنوائی کی ہے۔

یہ آواز بلند کرتے وقت ہمیں اس حقیقت کا پورا پورا احساس تھا کہ وہ زعمائے ادب اسے مطلقاً نظر انداز کر دیں گے جن کا بنیادی زاویہ نگاہ یہ ہے کہ خدا آسمانوں میں خوش ہے اور زمین پر سب کچھ ٹھیک ہے! ۔ ان بزرگوں کے لیے ہر دور میں سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنی شخصی منفعت اور ذاتی اغراض کے لیے وہ بآسانی ہر سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ بزرگ کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ان کی سرگرمیوں سے ہماری حیاتِ اجتماعیہ کیا اثرات قبول کرے گی اور کچھ مدت کے بعد ملک و قوم کو کن نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جب وہ شذرات لکھے گئے تھے تو یہ لوگ ہمارے پیشِ نظر نہیں تھے۔ ہمارے پیشِ نظر وہ لوگ تھے اور مستقلاً ہیں جو ادب کو ایک سماجی فریضہ سمجھتے ہیں، ایک متعینہ نصب العین کے ماتحت لکھتے ہیں اور جن کے افکار ذاتی نفع و نقصان کی سطح سے بلند ہو کر اجتماعی افادیت سے روشنی اور حرارت حاصل کرتے ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ حضرات جو ہر وقت اس چیز پر مستعد رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہر ذریعۂ آمدنی کو اپنے تصرف میں لے آئیں۔ وہ بھلا یہ کیوں سوچیں گے کہ ان امریکی اداروں کے پیچھے کونسا جذبہ، کونسی منظم تحریک برسرِ کار ہے۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ ان کی آمدنی میں بڑا معقول اضافہ ہو رہا ہے۔۔ اور حالت جب یہ ہے تو پھر غور و فکر و تردد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ۔ ہمارے ہاں یہ ذہنیت عام نہیں ہے۔ یہ نقطۂ نظر ہر ادیب کا نقطۂ نظر نہیں ہے۔ ہر شخص اس طرح نہیں سوچتا اور نہ ہی سوچ سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے ابھی وہ نگاہیں بھی موجود ہیں جو معاملات کی تہ تک پہنچنا اپنا فرض جانتی ہیں۔ اور ان ہونٹوں کی بھی کمی نہیں ہے جو تلخ سے تلخ حقیقتوں کے جرأت مندانہ اظہار سے بھی کبھی دریغ نہیں کرتے!

اصولی طور پر امریکی کتابوں کے تراجم سے ہمیں کوئی تعرض نہیں ہے۔ ترجمے کی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت ہے۔ ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا کی اچھی کتابوں کی بیشتر تعداد ابھی ہماری زبان میں منتقل نہیں ہوئی۔ ہمارے پڑھنے والوں کو ہر وقت ان کی ضرورت رہے گی۔ ان کتابوں کے تراجم جب ہماری زبان میں آئیں گے تو اپنے ساتھ تخیلات کی نئی دنیائیں۔ معنویت کی نئی وسعتیں اور زندگی کو سمجھنے کے نئے زاویے بھی لائیں گے۔ امریکی ادب ہی کے ایک مخصوص حصے کا نہیں، دنیا کے ہر اعلیٰ ادب کا ہم ہر وقت مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ مگر ہمیں اس امر پر شدید اعتراض ہے کہ کوئی ملک ایک منظم طریق پر، اپنے خاص مقاصد کے زیرِ اثر اپنی خاص کتابیں ترجمہ کرائے اور انھیں دھڑا دھڑ پھیلانا شروع کر دے۔ یہ فرض ہمارا ہے کہ ہم اپنی ضروریات کے ماتحت امریکہ کی یا کسی اور ملک کے ادب میں سے چند یا زیادہ کتابیں منتخب کریں اور ان کا ترجمہ کرائیں۔ ہم اپنی ذمے داریاں دوسروں کے سپرد کر کے خود کیوں خاموش ہو جائیں۔ ایک واضح اصول کے ماتحت اس بات پر غور کیجیے کہ اگر امریکہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے ملک میں اپنی کتابوں کے تراجم کے لیے منظم طور پر جد و جہد کرے تو پھر دنیا کے دیگر ممالک کو بھی یہ حق مل جانا چاہیے کہ وہ بھی ہمارے ہاں اپنے ادارے قائم کر کے شد و مد کے ساتھ اپنی کتابیں ہماری زبانوں میں پیش کریں اور ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے۔ جیسا کہ امریکی اداروں کے معاملے میں ہے۔ کہ مزاحمت کی بجائے ان سے

بہرطور تعاون کریں — جیساکہ ہمارے بعض اہلِ قلم اور بیشتر ناشرین کر رہے ہیں۔ یہ اصول اگر ایک بیرونی ملک کے لیے جائز سمجھا جاسکتا ہے تو باقی ملکوں کے معاملے میں بھی جائز سمجھا جانا چاہیئے۔ مگر کوئی ذمے دار پاکستانی شہری بھی ایسی صورتِ حال کو موزوں نہیں سمجھے گا۔ ہم اپنے ادب کو وسیع سے وسیع تر کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ملک کی اچھی کتاب کو ایک ایسا ہیرا سمجھتے ہیں جس سے ہمارے علمی و ادبی خزانے میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ کونسی کتاب اچھی ہے۔ ہمارا کام ہے۔ کسی غیر ملکی ادارے کا نہیں!

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ امریکی ادارے کن مقاصد کے پیشِ نظر اپنی کتابوں کا انتخاب کرکے انھیں ہمارے ہاں پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ پاکستان کے ایک بہت بڑے اشاعتی اور کتب فروش ادارے — پبلشرز یونائٹیڈ — کی وہ مطبوعات دیکھ لیں جو ایک امریکی ادارے کی وساطت اور تعاون سے اُردو میں منتقل ہوئی ہیں۔ بلکہ کہنا یوں چاہیئے کہ جنھیں ایک امریکی ادارے نے پبلشرز یونائٹیڈ کے تعاون سے اُردو میں پیش کیا ہے۔

اِن کتابوں میں ایک کتاب ارنسٹ ہمینگوے کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ باقی کتابیں کسی اور نوعیت کی ہیں۔ ہمینگوے کی کتاب غالباً باقی کتابوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے چھاپی گئی ہے۔ یہ بات پہلے لکھی جاچکی ہے کہ ان میں سے ہر کتاب پندرہ پندرہ ہزار کی تعداد میں چھپی ہے — اور ہر کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپے سے زیادہ نہیں — ایک کتاب ایسی بھی ہے جس کی ضخامت ساڑھے چھ سو صفحات کو محیط ہے!

یہ درست ہے کہ ہماری اپنی تہذیب کوئی چھوئی موئی نہیں ہے۔ دوسروں کے تہذیبی افکار بھلا ہماری ثقافت پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں۔ مگر ہمیں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ ٹیڈی بوائے اور یہ ٹیڈی گرل کوئی خود رو پودا نہیں ہے بلکہ کسی غیر ملکی تہذیب کے درخت ہی سے ٹپکا ہوا وہ پھل ہے جو ہماری جھولی میں آپڑا ہے!

امریکی اداروں کے طریقِ کار پر غور کیا جائے تو یہ مسئلہ غیر یقینی نہیں رہتا کہ وہ کیوں اپنی کتابوں کے ترجمے کے لیے اتنی تگ و دو کر رہے ہیں! یہ امریکی ادارے مترجمانہ کاوشوں کا سارا کا سارا معاوضہ خود ادا کرتے ہیں — مترجم غیر معروف نہیں ہوتا بلکہ اونچے درجے کا مصنف ہوتا ہے تاکہ کتاب کے وقار میں کوئی فرق نہ پڑے — اور پھر معاوضے کی شرح یہ ہوتی ہے کہ مترجم کو ایک صفحے کے لیے کم از کم دس روپے دیئے جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ یہ ادارے مترجم کے معاوضے کی ساری کی ساری ذمے داری اپنے اوپر لے لیتے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ جس ناشر کے تعاون سے وہ کتاب منظرِ عام پر لا رہے ہیں اسے اور قسم کی سہولتیں بھی دیتے رہتے ہیں — مثلاً کاغذ اور تصاویر کی فراہمی۔ کتابوں کی خریداری وغیرہ۔

یہ طریقِ کار اختیار کرنے کی ضرورت؟ اس فروغ کے پیچھے علم دوستی کا جذبہ برسرِ عمل ہے یا کچھ اور؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔

یہ مسئلہ اہلِ قلم کا مسئلہ ہے — اور اس باب میں غور و فکر کی تمام تر ذمے داری انہی اہلِ قلم پر عاید ہوتی ہے جو باشعور ہیں۔ قومی غیرت کے احساس سے بہرہ ور ہیں — اور اپنی تصنیفی کاوشوں کو حصولِ زر و منفعت کا ذریعہ نہیں — بلکہ سماجی فریضہ جانتے ہیں!

مجنوں گورکھپوری

ایک نقّاد شاعر

خورشید الاسلام کو ادبی اور تعلیمی دنیا میں روشناس ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ اور اب وہ ایک مستقل اور مستحکم مقام حاصل کر چکے ہیں۔ میں نے علی گڑھ آنے سے پہلے ان کے صرف تنقیدی اور ادبی مضامین پڑھے تھے۔ اور میں ان کو ایک نکتہ شناس اور متوازن ادبی نقاد کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں ایک انشائی کیفیت ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی ہر تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا ایک غیر معمولی تخلیقی شعور بھی رکھتا ہے۔

علی گڑھ آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ خورشید الاسلام شاعر بھی ہیں۔ لیکن اپنے شعر خاص خاص حلقوں میں سناتے ہیں۔ مجھے پہلے ان محفلوں میں اور پھر ریڈیو پر ان کا کلام سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کی غزلیں اور نظمیں بعض رسالوں میں نظر سے گذریں۔ مجھ پر جو مجموعی اثر ہوا۔ وہ یہ ہے کہ اول تو خورشید الاسلام نمود اور شہرت کے لئے شعر نہیں کہتے۔ بلکہ اپنی اندرونی تحریک سے اور اس کی تسکین کے لئے لکھتے ہیں۔ دوسرے وہ اپنے تمام جدید میلانات کے باوجود محض اجتہاد یا جدت طرازی سے کام نہیں لیتے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور ان کو اردو شاعری کے قدیم و جدید اساتذہ و مشاہیر کے کلام پر مبصرانہ عبور حاصل ہے۔ اس مطالعہ سے انہوں نے اپنے شعورِ شعری کی تربیت میں بڑا کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی انقلابی سے انقلابی اور باغیانہ سے باغیانہ میلانات کی حامل نظم یا غزل میں بھی ایک کلاسیکی سنجیدگی نظر آتی ہے۔ جو پرخلوص مطالعہ اور اس مطالعے کے اثرات کو اپنی فطرتِ شعری کا ترکیبی جز بنائے بغیر ممکن ہی نہیں۔

میں کسی صاحبِ قلم کی تحریروں کو تنقید اور تخلیق کے الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں۔ دنیا میں ایسی مثالیں کم نہیں ہیں کہ شاعر ناقد رہا ہو یا ناقد شاعر۔ سر فلپ سڈنی، ڈرائیڈن، طامس گرے، کولرج، ورڈسورتھ، شیلی، میتھو آرنلڈ اور رابرٹ برج س کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان میں سے بعض شاعر زیادہ تھے اور بعض ناقد زیادہ۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ ان کی شاعری ان کی تنقید کو اور ان کی تنقیدی بصیرت ان کی شاعری کو صحت مند طور پر متاثر کرتی رہی ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ ایک شاعر تنقید نہیں کرسکتا۔ یا ایک ناقد شاعر نہیں ہوسکتا شاعری کا محدود تصور ہے۔ جس کی بنیاد چند روائتی مفروضات پر ہے۔ آج زندگی جس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے اسی اعتبار سے شعر اور فن کاری کا دائرہ بھی وسیع ہوگیا ہے۔ جو ایک فطری اور لازمی امر تھا۔

خورشید الاسلام کی شاعری میں بےدردگی، خود باختگی اور گم شدگی کا احساس تو کم ملتا ہے لیکن ان کے یہاں جذباتی شدت خلوص کے ساتھ وہ توازن اور سنجیدگی محسوس ہوتی ہے۔ جو فکر و تامل ہی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ اس میں احساس و تاثر کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے۔ لیکن وہ بغیر سوچے سمجھے اپنے تاثرات کو الفاظ میں ظاہر نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اور شاعری کی ایک اہم قسم وہ بھی ہے جس میں شدتِ تاثر اس ضبط و اعتدال کی پابند ہو جو تفکر کا تقاضا ہے۔ خورشید الاسلام کے اسلوب کی انفرادیت میں اسی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

اسی کا نام ازل ہے۔ اسی کا نام ابد۔
وہ ایک رات جو ہم لوں سکے درمیاں گذری

اس شعر کا تاثر کوئی غیر معمولی یا اچھوتا نہیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ایسے احساس کا اظہار ہے جو اگرچہ عامۃ الورود ہے مگر جس کے اظہار پر ہر کس و ناکس قادر نہیں۔ اس سے پہلے بھی اس مضمون کے اشعار کہے جا چکے ہیں۔ لیکن جو خصوصیت اس شعر کو ہمارے لئے نیا شعر بنائے ہوئے ہے۔ وہ زبان و اسلوب کا نیا پن ہے۔ یہ نیا پن بیک وقت شاعر کی جدّتِ تخیّل اور اس کی وسعتِ مطالعہ کی ہم آہنگی سے پیدا ہوا ہے۔

خورشید الاسلام کی نظموں اور غزلوں میں اس قسم کے اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ ان کے یہاں قدیم و جدید کا ایک خوشگوار اور بلیغ توازن ہے۔ ماضی کی زندہ روایتیں ایک جدید اسلوب میں سامنے آتی ہیں۔ اور حال کے مسائل ایک کلاسیکی لہجے میں پیش ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ خورشید الاسلام محض شاعر نہیں وہ باریک نظر ناقد کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ ان کی فنّی بصیرت اس ناقدانہ شعور کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر شعر کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ جس طرح انہوں نے نثر میں ایک الگ اسلوب نکالا ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری میں ایک نئے لہجے اور اسلوب کے عناصر ملتے ہیں ــــ نثر ہو یا شعر اسلوب کے بھرپور اظہار ہی سے بنتا ہے۔ خورشید الاسلام کی نظمیں ہوں یا غزلیں ان میں ایک ایسی انفرادیت نمایاں ہے جسے انکشافِ ذات کہا جا سکتا ہے۔ یہ انفرادیت ایک ایسے شاعر کی ذات کا انکشاف ہے جس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں۔ بلکہ ہر طرح کے تجربے کو جذبے کی شدت کے ساتھ محسوس بھی کیا ہے۔ جذبہ جتنا دامنگ اور روشن ہو گا۔ اسی قدر اس میں تفکّر کی پرچھائیاں بھی پڑیں گی۔ ان کے جذبے کی شدت اور وضاحت ہی کہیں کہیں ان کے اشعار میں فکر کی اساس بن گئی ہے۔ خورشید الاسلام کے مختصر سے مجموعۂ اشعار میں اُن کی انفرادیت کا اظہار انہی دو عناصر کے سہارے ہوتا ہے۔ انکشافِ ذات، جو کسی ایک فرد کی ذات کا انکشاف نہیں۔ بلکہ پورے معاشرے کے تلخ و ترش حقائق کا انکشاف ہے۔ مگر ان کی شاعری میں بعض دوسرے معاصر شعرا کی طرح گھٹے ہوئے انفرادی غم کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ایسی کھلی فضا ملتی ہے۔ جس میں ایک ذات کا غم ساری انسانیت کا غم بن جاتا ہے۔ اور اسی میں ان کی انسان دوستی کا جاندار شعور نمایاں ہوتا ہے۔ طنز کی تلخی میں کلبیت نہیں بلکہ ماحول کے واضح شعور کے ساتھ محسوسات اور جذبات کے دائرے میں غلط سماجی عوامل پر وار کرنے کا حوصلہ ہے۔ انسان دوستی کے اعلیٰ تصور نے اُن کے نقطۂ نظر کو بھی وسعت دے کر ایک ذات کو تمام عالمِ انسانیت بنا دیا ہے۔

خورشید الاسلام کی شاعری میں انفرادیت کی دریافت کے بعد ضروری ہے کہ اسی روشنی میں ان کی شاعرانہ خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے خورشید الاسلام کا لہجہ اور انداز بیان کلاسیکیت سے قریب ہوتے ہوئے بھی کہیں روایتی نہیں ہونے پایا۔ ان کی شاعرانہ بصیرت نے روایات کو الٹ کر بھی کلاسیکی انداز کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس کی ایک مثال یہ شعر ہے ؎

جنوں نہیں ہے کہ چاکِ دامن کو آبروئے بہار سمجھیں
خزاں کی یلغار میں بھی ہمدم ہم اپنا دامن سیا کئے ہیں

یہاں بہار کے ساتھ ہی جنوں اور چاکِ دامن کا روایتی تصور بالکل الٹ دیا گیا ہے۔ مگر زبان اور علامتیں وہی ہیں۔ یہی کوشش بعض مقامات پر روایات کی توسیع کا سبب بھی ہو گئی ہے ؎

کہیں لپک اٹھے شعلے کہیں مہک اٹھے گل شبِ فراق نہ پوچھ کہاں کہاں گذری

اس شعر میں نہ صرف روایت کو وسعت مل گئی ہے بلکہ اس میں گہرائی بھی پیدا ہو گئی ہے ــــ روایات کو نئی زندگی، وسعت اور گہرائی دینے کے لئے استعاروں کا بلیغ اور نیا استعمال بھی ناگزیر ہے یہ شعر پڑھیئے ؎

شمع جلتی ہے تو پروانوں کا آتا ہے خیال۔
اور بجھتی ہے تو بجھنے پہ ملال آتا ہے۔

ان دو مصرعوں میں استعارے کی بلاغت نے زندگی کے رُخ سے اس طرح نقاب اٹھائی ہے کہ بالکل نیا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ یا یہ شعر دیکھیئے ؎

وہ عشقِ گل تھا کہ گل چیں کے ہم عدو ٹھہرے
یہ رشکِ گل ہے کہ ہم باغباں سے روٹھ گئے۔

استعارے وہی ہیں، علامتیں وہی ہیں۔ مگر ان کے استعمال نے شعر میں بلاغت کے ساتھ ساتھ نزاکتِ احساس بھی پیدا کر دی ہے۔ خورشیدالاسلام کے "انکشافِ ذات" کی شاعرانہ سعی ذہنی واردات کی دریافت کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ اپنی داخلی کیفیت کی دید ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کو زبان دینا تو اور مشکل ہے ؎

عینِ ہجراں میں بھی ملتی ہے کبھی لذتِ وصل
عین لذت میں بھی لذت پہ زوال آتا ہے۔

اگر آپ اس شعر کو پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر رک کر سوچیں تو اندازہ ہوگا کہ انسان کے بعض نفسی عوامل کا ایسا مناسب شاعرانہ اظہار کس قدر دقتِ نظر چاہتا ہے۔ یہی واردات کہیں کہیں نئی حقیقت کو منکشف کر دیتی ہیں ؎

کہاں ہیں اہلِ بہار اور کہاں ہے دعوتِ گل
کہ بے نصیب گل و گلستاں سے روٹھ گئے۔

امیدوں کی شکست اور خوابوں کی پریشانی کی اس سے زیادہ شاعرانہ تصویر کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تمام اشعار غزلوں کے ہیں۔ اگر ان اشعار کو غزل میں رکھ کر انہیں کے مقام پر پڑھا جائے تو ایک اور خصوصیت واضح ہوتی ہے۔ روایتی غزل گویوں کی طرح خورشیدالاسلام محض ریزہ خیالی کے قائل نہیں۔ ان کی غزلوں میں فضا اور تاثر کی وحدت ملتی ہے۔ بہت کم غزلیں ایسی ہیں جن کے اشعار میں کمل طور پر تاثر کا ربط نہ ملتا ہو۔ اور متضاد کیفیات نظر آئیں۔ مسلسل غزل کے فن کو برتنے کا رواج آج کے متغزلین میں عام ہے۔ خورشیدالاسلام کی غزلوں میں کسی مخصوص ذہنی رویے یا حالت کی ممکن منزلیں حُسنِ ترتیب سے ایک کے بعد ایک سامنے آتی ہیں۔ ان کی غزلوں کا یہ انداز انہیں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ اور جذبے یا احساس کی شدت کو مختلف سمتوں میں پھیلنے سے روک کر ایک ہی رُخ پر ڈال دیتا ہے۔ اس وحدتِ تاثر و فکر کے باوجود ان کی غزلوں میں "نظمیت" پیدا نہیں ہونے پاتی۔ اس لئے کہ وہ غزل کے کلاسیکی آرٹ کو برتنا جانتے ہیں۔

انسان دوستی کا ایک مثالی تصور جس کی جڑیں انسانوں کی زمین اور شاعر کے دل میں پیوست ہیں۔ لہجے کا انفراد اور موسیقی کی مردانہ لے، پرانی علامتوں اور استعاروں کا نئی قوت سے استعمال ان اشعار کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات کے پہلو بہ پہلو دو اور باتیں نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر کہیں کہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتا کہ اظہارِ خیال کے لئے شاعرانہ زبان کا التزام کیا گیا ہے۔ عام طور پر غزل میں چمن کے ساتھ گل و لالہ، سرو و سمن، نسیم و شمیم، خزاں اور بہار کے الفاظ روایتی طور پر محض زبان کو شاعرانہ رنگ دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

خورشیدالاسلام کہیں بھی یہ التزام نہیں برتتے۔ وہ روایتی زبان کو شاعری کے لئے لازمی سمجھنے کی بجائے نئے الفاظ کو بھی شعریت میں ڈھالتے اور پرانے الفاظ کو بھی نئے معنی اور نئی قوت کے ساتھ استعمال کرنے پر قادر ہیں۔ ان کی غزلوں میں لہجے کی مردانگی، طنز کی تلخی اور انفرادیت کے بے محابا اظہار کے ساتھ ہی موسیقیت کی لہریں بھی آواز کے ارتعاش اور اتار چڑھاؤ کا ساتھ دیتی ہیں۔ ان اشعار کو پڑھیئے ؎

یہ دیکھ کر کہ غمِ دو جہاں ہے رسمِ جہاں   جو اہلِ غم تھے غمِ دو جہاں سے روٹھ گئے

تو صبا کی طرح ذرہ کارِ عزیزاں　　　میں صبا کی زلفِ تاباں مجھ کو نہ چھیڑو

خورشید الاسلام کی کئی غزلیں ایسی ہیں جنہیں وحدتِ تاثر کی بنا پر نظم کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے اس سے بالکل بحث نہیں کہ ان کو نظم کہا جائے یا غزل۔ میں تو محض یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان غزلوں میں یقیناً زندگی کی حقیقت کے احساس کا ایسا اظہار ہے۔ جو صرف ایک جدید ذہن سے ممکن تھا۔ اس جدید ذہن کا زیادہ مکمل اظہار ان کی نظموں میں ہوتا ہے۔ سرراہے، دل، سوال، مجبوری، اندیشے، بے دماغی، تجربہ، ویرانی، آرزو، وجود یہ تمام نظمیں کسی نہ کسی طرح پرانی ہیئت کی پابند ہیں۔ مگر جدید ذہن اپنی تمام پیچیدگی اور تہہ داری کے ساتھ اس پابندی میں بھی نمایاں ہے۔ دوسری نظمیں مثلاً بزرگ، جنبی، اجنبی سے، خیر و شر، ایک تاثر، آدمی، انقلاب، نئی دنیا اور پیاس ہیئت کے لحاظ سے بھی جدید ہیں۔ اور انداز بیان میں بھی روایتوں کو توڑنے کا جذبہ محسوس ہوتا ہے۔ مگر اس انحراف میں بھی ایک کلاسیکی آہنگ (؟) ہے۔ پابند نظموں میں سرراہے، آرزو، وجود اور مجبوری نئے ذہن کے تجربات اور محسوسات کی پیچیدگی اور شدت کو بڑی کامیابی سے پیش کرتی ہیں۔ ان نظموں میں جہاں زندگی پر اعتماد، حسن اور خیر سے محبت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہیں زندگی اپنی ساری بوقلمونیوں کے ساتھ نظر کے سامنے بھی آجاتی ہے۔ "سرراہے" میں جو مرکزی خیال ہے وہ جدید دور سے پہلے تصور میں نہیں آسکتا تھا۔ لیکن اس نظم میں ایک لفظ اور ایک ترکیب بھی ایسی نہیں ہے جس کو خیال کی جدت سے ہر طرف ہو کر پرانے سے پرانا ذہن ہر شاعری کی روایتی زبان کا خوگر ہو قبول نہ کرسکے۔ ان کی ایک اور نظم "سوال بھی ہے" یہ سچ ہے کہ اس میں وہ اپنے خیال کو زیادہ پھیلا نہیں سکے ہیں۔ لیکن وہ زبان اور اندازِ بیان کی کلاسیکی آبرو کو قائم رکھتے ہوئے کم سے کم اتنا تو کر ہی گذرے ہیں کہ اپنے دور کی جو مجسم سوال ہے۔ صدقِ دل کے ساتھ نمائندگی کریں۔ ان کی جدید تر نظموں میں یہی سوالیہ علامت ایک زاویۂ فکر بن گئی ہے۔ جس میں موجودہ سماجی اور معاشی، روحانی اور مذہبی اقدار کی طرف سے بے اطمینانی کا بھی احساس ہے۔ اور محض روحانی اور ذہنی ناآسودگی کا اظہار بھی جو ہمارے معاشرے میں روشنیٔ طبع کے امانت داروں کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ان کی ایک نظم "پیاس" ہے۔ جو کافی روشناس ہو چکی ہے۔ لوگ اس کو کیوں پسند کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن مجھے یہ نظم اس لئے وقیع معلوم ہوتی ہے کہ تصور اور میلان کے اعتبار سے یہ بالکل نئے دور کی پیچیدہ نفسیات کی نمائندگی کرتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کا احساس بھی دلاتی ہے کہ شاعر نے زندہ ماضی کی روایتوں سے اپنا رشتہ نہیں توڑا ہے۔

خورشید الاسلام کی بیشتر نظمیں فکر انگیز ہیں۔ اور ان میں کوئی نظم ایسی نہیں جس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی سمٹ کر مرکز پر نہ آگئے ہوں یہ نظمیں باوجود اختصار کے ہم کو بلیغ اشارے دے جاتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی نظم ایسی نہیں جس میں انہوں نے زبان کے ساتھ زیادتی یا توڑ مروڑ کیا ہے جو نئی نسل کے اکثر شعراء اپنی خودسری میں، اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مجھے خورشید الاسلام کی شاعری اپنی طرف اس لئے متوجہ کرتی ہے کہ وہ قدامت پرستی کے دشمن ہوتے ہوئے بھی اپنی ثقافتی میراث کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ میں اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے ان کے چند متفرق اشعار یہاں درج کرنا چاہتا ہوں۔ جن میں سے ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل مضمون ہے۔

آتی ہے اسی موج سے دریا میں روانی　　　جس موج کی تقدیر میں ساحل نہیں ہوتا

ہم رقص بہ اندازۂ انجام کریں گے　　　بے نام عبادت سحر و شام کریں گے

عیشِ پرویز کی بیداد رہے گی کب تک　　　کاہشِ محنتِ فرہاد رہے گی کب تک

تیرا پھیکا سا تبسم بھی ہے میخانہ بدوش　　　میری آنکھوں کا لہو بھی کس قدر بے رنگ ہے

دیکھا انہیں قریب سے ہم نے تو رو دیئے　　　جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

یادوں کے سانچے میں ڈھلتے رہے شمع خاموش بن کر جلتے رہے　　　اپنی تنہا روی، اپنا سوز دروں، ہم بھی دنیا میں اک ماجرا ہو گئے

کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب و تب ہم
کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا کوئی صنم

وہ سادہ دل ہیں کہ غیروں کو رازداں جانا
وہ بدگماں ہیں کہ ہر رازداں سے روٹھ گئے

وجودِ آدمی سے پیشتر ہی
سرِ آدم قلم ہونے لگا ہے۔

بہ شکلِ قامتِ آدم بہ طرزِ رقصِ پری
ہمارے سر پہ قیامت بھی کیا جواں گزری

تجھ پہ کیا گذری کہ پاسِ عاشقاں کرنے لگا
یعنی ہم پر وہ تری مشقِ ستم جاتی رہی۔

شمع جلتی ہے تو پروانوں کا آتا ہے خیال
اور بجھتی ہے تو بجھنے پہ ملال آتا ہے۔

خدا شاہد کہ زندگی میں وہ سجدہ ہائے غمِ محبت
قضا ہوئے تھے جو گاہ گاہ بہ شرطِ فرصت ادا کئے ہیں۔

یاں کفر و دیں کے جاننے والوں سے کیا غرض
یاں کفر و دیں کے ماننے والوں سے عشق ہے

ہماری خوش نظری کی حکائتیں ہیں لطیف
گذر گئی ہیں زمینوں کو آسماں کہتے

کوئی فریب تراشو، کوئی چراغ جلاؤ
یہ ایک رات کسی طور سے بسر کر جاؤ

دیوانیوں نے بڑھ کے گلے سے لگا لیا
بے کردلوں میں کتنے خزانے چلے تھے ہم

داغ دھل گئے اب تو درد میں کمی سی ہے
زندگی نہ جانے کیوں پھر بھی اجنبی سی ہے

یہ اشعار ایسے نہیں ہیں جن پر شاعروں کی صحبت میں واہ واہ کی جائے یا سرسری طور پر ان کو سنا کر یا ان پر نظر ڈال کر رہ جایا جائے۔ شاعری کا فن نیم اظہار کا فن ہے۔ اور جب تک اس کی گویائی میں اس کے سکوت کی بلاغت کو بھی شامل نہ کر لیا جائے اس کے شعری پوری فکری کائنات کو سمجھنا مشکل ہے۔ شاعر خود سوچ سمجھ کر نیم سکوت اور نیم گویائی میں اپنی بات کہتا ہے۔ اور سوچ سمجھ کر ہی اس کے اشعار کی معنوی دنیا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ اسی شاعر کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ جو اگر شاعر سے زیادہ نہیں تو شاعر کے ساتھ ساتھ ناقد بھی ہو۔ اور اس کی نظر اس کے دور تک کے مختلف شعری اکتسابات پر گہری ہو۔

اس دور میں اگر کوئی شخص تنقید و تخلیق دونوں میں ایسی چیزیں پیدا کر رہا ہے جو نہ صرف فنی اعتبار سے وقت اور وزن رکھتی ہیں۔ بلکہ اپنے اندر ایسی فکری اور جمالیاتی کیفیتیں بھی رکھتی ہیں جو ہماری توجہ کو اپنی طرف مائل کئے بغیر نہ رہیں، تو ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ خورشید الاسلام تنقید میں تو ایک خاص مرتبہ رکھتے ہی ہیں لیکن ان کی شاعری بھی ایسی نہیں جس کی طرف سے سوچنے والے ذہن بے اعتنائی برت سکیں۔ آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خورشید الاسلام کی شاعری کی کمیت پر نہیں جانا چاہیئے۔ اس کی کیفیت پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ نئے معانی کی دریافت، پرانے معانی کی توسیع، قدیم اور جدید کا خوشگوار توازن، تجربات کا تنوع، مسائل کی ساری پیچیدگیوں کا گہرا شعور، ایجاز و اختصار اور ایک تازہ و منفرد اسلوب اُن کی شاعری کے امتیازی نشان ہیں۔

تنقید کے ساتھ ساتھ شاعری بھی ان سے مزید ریاضت کا تقاضا کر رہی ہے۔

مصطفیٰ زیدی

چراغاں

ترے واسطے ہم نے کلیاں بکھیری تھیں، تارے سجائے تھے، کیا کچھ کیا تھا
جو برسوں سے چاک و دریدہ چلا آرہا تھا وہ اپنا گریباں سِیا تھا

نئے پھول مالی سے منگوائے تھے، بام و در کو نیا رنگ و روغن دیا تھا
کتابیں قرینے سے رکھ دی تھیں، بوتل ہٹادی تھی، گھر میں چراغاں کیا تھا

اگر علم ہوتا کہ تو آج کی شب نہ آئے گی تو حسبِ معمول رہتے
ترے غم کی مدھم سی سوزش میں جلتے مگر تجھ سے دل کی حکایت نہ کہتے

نہ کہتے کہ اب ایک اِک رگ سے، اک ایک موئے بدن سے دھواں اُٹھ رہا ہے
جو ٹھہرا تھا اپنی خودی کی سرائے میں وہ ضبط کا کارواں اُٹھ رہا ہے

تجھے آج تک خط نہ لکھا تھا اور آج بھی یہ نہ لکھتے کہ ہم مر رہے ہیں
نگاہوں سے سب کچھ بتاتے، قرینے سے کہتے، کہ دل کو لہو کر رہے ہیں

مگر تیری غفلت نے (شاید ترے شیوۂ امتحاں نے) یہ منزل دکھا دی
کہ تھم تھم کے آنسو نکلتے تھے پہلے مگر آج تو دل کی ندی چڑھا دی

اگر پہلے صرف ایک واماندگی تھی تو اب دست و پا جیسے شل ہو گئے ہیں
چلے تھے کہ دُنیا کو رستہ دکھائیں اور اب جیسے جنگل میں خود کھو گئے ہیں

شفق گھر تک آنے کو تھی، ہم نے سوچا تھا جلوؤں کا، نغموں کا ڈیرا رہے گا
چراغاں کیا تھا، مگر کیا خبر تھی، کہ اب صبح کو بھی اندھیرا رہے گا

ڈاکٹر وحید اختر

جلاوطن

ہوا کی کاٹتی تلوار جسموں میں اُترتی ہے
فضا میں خون کی بوندیں لَویں بن کر چمکتی ہیں

مرا سنسان، بے ترتیب کمرہ، قبرِ تنہائی
جہاں ہر ایک پل بھاری ہے یادوں کے رسولوں پر
جہاں شبنم ٹھہرتی ہی نہیں ہے آ کے پھولوں پر
وہ کرسی جس کے دستے پر اٹی ہے گردِ مدت سے
حِنائی انگلیوں کا نقشِ نازک ڈھونڈتی ہوگی
وہ بستر کی شِکن جو بن گئی تقدیر کا لکھا
کسی کے جسم کی نرمی سے مٹنا چاہتی ہوگی
وہ تکیے جو ہلکِ بازاری غلافوں کا کفن پہنے
کسی کے ہاتھ کی بخیہ گری کو یاد کرتے ہیں
میں ان یادوں کی دیواروں میں ہوں اک عمر کا قیدی

مری دیرینہ ہمدم، میرے بچپن اور جوانی کے
حسیں خوابوں کی محرم کچھ کتابیں مجھ سے کہتی ہیں
"ادھر آؤ، اٹھا کر ہم کو سینے سے لگا لو تم"
"ہمارے آشنا لفظوں کو حال اپنا سُنا لو تم!"
کتابیں جن کے اوراقِ جہاں دیدہ کے سینے پر
معانی اور لفظوں کا اُمڈتا سیل بہتا تھا
بچشمِ منتظر رہ رہ کے تجھ کو یاد کرتی ہیں
صدف لفظوں کے، معنی کے گہر سے ہیں تہی ایسے

کہ جیسے تیری نظریں حُسن کے موتی لے گئیں سارے
یہ بے پایاں سمندر ابرِ نیساں کو ترستے ہیں!

ہوا کی کاٹتی تلوار تیرے شہر کی حد میں
بڑی نرمی سے موجِ صبح گاہی بن کے چلتی ہے
ترے پھولوں کے دامن پر نہ ہوں گی خون کی بوندیں
کہ آنسو بھی مرے اب دھوپ میں گم ہو چکے ہوں گے
وہ آئینہ کسی انجان رستے میں پڑا ہوگا
جو صبحِ وصل و شامِ قرب کا شاہد رہا برسوں
وہ آئینہ گذرتے عورتوں مردوں کے چہرے میں
ہمارے خال و خد کا عکس اب کیا ڈھونڈتا ہوگا
ہزاروں روز و شب کی گرد سے دھندلا چکا ہوگا
وہ چشمِ منتظر بھی جاگ کر پتھرا گئی ہوگی
اُداسی اُس کو نسیاں کا کفن پہنا گئی ہوگی

مری آنکھیں کھلی ہیں، شہر تیرا جاگتا ہوگا
ہزاروں کوس کی دُوری بھی وہ سفاک قاتل ہے
جو یادوں کے چراغوں سے چمک تک چھین لیتی ہے

چھُٹا جب شہرِ جاناں، غم نے زادِ راہ بخشا تھا
اسی غم کے اُجالے میں ابھی تک جاگتا ہے دل
یہ دولت بھی کہیں گم ہو نہ جائے دشتِ غربت میں
کہ ہر اک موڑ پر ہیں گھات میں رہزن بھی قاتل بھی
غم و فکرِ معاش اب تک لگا ہے ساتھ پہلو کے
یہ رہبر رہزنوں کے ساتھ مل کر لوٹ لیتا ہے

میں اُن راتوں سے ڈرتا ہوں، کبھی جو یوں بھی آئیں گی
کہ آنکھیں جاگتی ہوں گی، مگر دل سو رہا ہوگا

جلیل حشمی

ابنِ مریم

تیز ہوا میں دیا جلائے کب تک کھڑے رہیں گے ہم
بکھر نہ جائے تیرے دامن کا ہنستا پھول کہیں جانم
آ اِن پیڑوں کی اوجھل میں بیٹھیں، بات کریں کچھ ہم

میں دیوانہ تنہائی کے نجد کا تھکا بگولا ہوں
نگری نگری پھرا ہوں اِتنا، گھر کا رستہ بھولا ہوں
میری سُلگتی پلکوں پر ٹپکا نظروں کی شبنم

اور قریب آ ـــــ پیراہن کے چاک میں دلسوزی سے جھانک
میرے رِستے ہوئے دشت میں کوئی پھول کی پتّی ٹانک
میرا دامن تھامنے والے! تجھ پر قرباں میرے غم

جنم جنم کی صلیب ہٹا دے نُورُ آسا ہاتھوں سے تُو
تیری سانسوں سے آتی ہے جانی پہچانی خوشبو
آ ٹوٹے شیشوں کے مسیحا! تجھ پہ واروں یروشلم

ڈاکٹر عزیز تمنائی

آہستہ خرام

سُنو نوخیز شگوفوں کا پیام
مائلِ نشو و نما
سالکِ راہِ بقا
ظلمتِ شب تہِ پا مطلعِ انوار بکف
دھیرے دھیرے سے چلے جاتے ہیں منزل کی طرف

چُپکے چُپکے ہے رواں
کوئی آہٹ نہ کفِ پا کا نشاں
ہر نئے موڑ کو سہلاتی ہوئی
دلِ ہر راہ کو بہلاتی ہوئی
سالہا سال سے آہستہ خرام
اُس کی رفتار ہے پابندِ نظام

روشِ گُل پہ نسیمِ سحری کا یہ خرام
موجِ رفتار کا ساز
بجتا جاتا ہے مگر بے آواز
کاشفِ رازِ حیات
نقشِ اندازِ حیات
دستِ نازک میں سنبھالے ہوئے دامانِ بہار
محوِ مشاطگیِ گیسوئے صبحِ گلزار

سطحِ اعصاب پہ اُبھری ہوئی موجِ احساس
سیلِ جذبات کی رَو میں نہ کہیں بہہ جائے
دیکھنا گرمئ رفتار نہ بڑھنے پائے
ہر اُبھرتی ہوئی موجِ احساس
کرے فطرت کی روایات کا پاس
شانِ آہستہ خرامی سے بڑھے
جب سوئے ساحلِ اظہار چلے

چشمۂ دہر سے نکلی ہوئی جوئے ایام

مظہر امام

تحفہ

سوچتا ہوں کہ تجھے کون سا تحفہ بھیجوں؟

اپنے ہونٹوں کی جلن، اپنی نگاہوں کی تھکن
اپنے سینے کی گھٹن، اپنی اُمنگوں کا کفن
جادۂ زیست پہ بکھرے ہوئے کانٹوں کی چُبھن

عمر بھر کا مرا سرمایہ یہی ہے لے دوست!

آرزو تھی کہ رخِ فن کی چمک نذر کروں
زلفِ خم دار معانی کی مہک نذر کروں
اپنے بازوئے تخیّل کی لچک نذر کروں

ساغرِ فکر مگر آج تہی ہے لے دوست!

وہ بھی دن تھے کہ سزاوارِ محبت تھا میں
خندۂ حور تھا، پروردۂ جنّت تھا میں
اپنی دنیائے مجازی میں حقیقت تھا میں

اب پلٹ آئیں وہ لمحات، کہاں ممکن ہے؟

پالکی کاہکشاں کی مرے گھر آتی تھی
چاندنی رات بہ اندازِ دگر آتی تھی
ساعتِ وصل سے پہلے نہ سحر آتی تھی

پہلے جو بات تھی وہ بات، کہاں ممکن ہے؟

کتنے ناسور ہیں پوشیدہ مرے سینے میں
اشک آنکھوں سے ڈھلک آتے ہیں مے پینے میں

"اپنی" صورت نظر آتی نہیں آئینے میں
رشتۂ لطف و کرم ٹوٹ گیا ہے مجھ سے

وہی دن بھر کی مشقت، وہی شب بھر کی تھکن
وہی برباد مسرت، وہی آباد محن
ہاں وہی روح کی ٹھنڈک، وہی سانسوں کی جلن
دامنِ کیفِ طرب چھوٹ گیا ہے مجھ سے

چہرۂ فکر پہ اب گرد جمی پاتا ہوں
استعاروں کی عنایت میں کمی پاتا ہوں
اپنے جذبات کی آنکھوں میں نمی پاتا ہوں
پیکرِ شعر بھلا شعلہ بجاں کیا ہوگا؛

بے کلی سینۂ گیتی میں اُترتی ہی رہی
روز و شب زلف زمانے کی بکھرتی ہی رہی
زیست لیکن مرے شعروں میں "سنورتی" ہی رہی
مجھ سے بڑھ کر کوئی آشفتہ بیاں کیا ہوگا؛

تجربے چند حبابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
علم دو چار کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میری منزل مرے خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
جس سے ڈرتا تھا، مرا حال وہی ہے اے دوست!
سوچتا ہوں کہ تجھے کون سا تحفہ بھیجوں؟

اپنے ہونٹوں کی جلن، اپنی نگاہوں کی تھکن
اپنے سینے کی گھٹن، اپنی امنگوں کا کفن
جادۂ زیست پہ بکھرے ہوئے کانٹوں کی چبھن
عمر بھر کا مرا سرمایہ یہی ہے اے دوست!

رحمان فراز

ایک اجنبی شہر

شہر کی چوڑی گلیوں میں یہ اُونچے سرد مکان
جن کے بند جھروکوں میں اِک دُنیا کا ہیجان
پَل پَل زہر کے گھونٹ پلاتے۔ لوٹتے سب مُسکان

بند مکاں ۔سنسان قلعے ۔ اِک اِک اُجڑی دیوار
تیرگیوں کو کاٹ سکی نہ کرنوں کی تلوار
اُگی ہوئی ہے ہر اِک سُو کائی کی سبز قطار

ان ویران گھروں میں کبھی نہ یاد کے دیپ جلے
یہ کمرے ہنستے رنگوں میں کبھی نہ ڈوب سکے
بھول چکے ہیں اب یہ باسی کتنے ہی چہرے

دھول میں اَٹی ہوئی ہے ہر اِک سُونی راہگذار
در و بام پر کتنے بھاگتے لمحوں کا ہے غبار
ہر چھت اب کے سُونی ہے، اُجڑی ہے ہر دیوار

اِن ویران منڈیروں پر کب کوئی پھُول کِھلا
یہاں نہ دیکھا ریشمی کپڑوں کا کوئی سایا
مجھ ایسا جو بادل آیا، ، نیر بہا کے گیا

ڈاکٹر وزیر آغا

یہ معصوم لوگ

مجھے اپنے دوست ــــ ع سے شدید محبت ہے۔ اور میرا یہ دوست اردو شاعری کے روایتی محبوب کی طرح میری بجائے کسی اور پر جان چھڑکتا ہے۔ اگر آپ کو اس بات کا ثبوت درکار ہے تو میں یہ مشورہ دوں گا۔ کہ آپ سب سے پہلے صبح کی سیر کے عارضے میں چپکے سے مبتلا ہو جائیں اور صبح اٹھتے ہی ہو بے پاؤں میرے "یار" کی گلی سے گذرنے کی عادت ڈالیں۔ سرخ اینٹوں والے مکان کے سامنے لحظہ بھر کے لئے رکیں۔ اور ٹکٹکی باندھے اس مکان کے چبوترے کو دیکھتے رہیں۔ ابھی دس منٹ بھی نہیں گذریں گے کہ آپ کو ہڈیوں کا ایک سیہ فام ڈھانچہ، جانگیہ پہنے اور پانی کا فوارہ ہاتھ میں لئے بیٹھک کے دروازے سے برآمد ہوتا نظر آئے گا۔ وہ باہر نکلتے ہی اپنا فوارہ زمین پر رکھ کر یا علی کا نعرہ لگائے گا۔ اور دو تین منٹ تک اس زور و شور سے ورزش کرے گا کہ ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز گلی کے موڑ تک سنائی دے گی۔ اس کے بعد وہ اپنے بازوؤں کی مچھلیاں کو ٹٹولے گا۔ اور اگرچہ یہ مچھلیاں محبوب کی "کمر" کی طرح مادی نظروں سے اوجھل ہوں گی۔ تاہم وہ بازوؤں کی ہڈیوں کو تھپتھپا کر ان کے وجود کا اعلان کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ اور پھر فوارہ اٹھا کر قطار اندر قطار رکھے ہوئے گملوں پر پانی کے علاوہ اپنی جان بھی چھڑکنے لگے گا۔ وہ ہر گملے کو پہلے غور سے دیکھے گا۔ اس میں اُگے ہوئے پھول کو انگشتِ شہادت سے چھو کر اس کی نرمی اور ملائمت کا ایک تصور قائم کرے گا۔ گملے کو ناک تک اٹھا کر پھول کی خوشبو سونگھے گا۔ ایک لمبا آسودہ سانس لے گا۔ اور گملے کو کمال آہستگی سے اس کی اصل جگہ پہ رکھ کر پانی دینے لگے گا۔ گملوں میں آپ کو طرح طرح کے پھول ہنستے مسکراتے اور شرارتیں کرتے نظر آئیں گے۔ اور میرا دوست دنیا و مافیہا سے بے خبر اس معصوم مخلوق کی معیت میں زندگی کے بہترین لمحات بسر کرتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ گلی جاگ اٹھے گی۔ بچے اور مرغ شور مچانے لگیں گے۔ جھاڑو کی ضربوں کی کرخت آواز بلند ہونا شروع ہو گی۔ اور کمیٹی کے نل پر برتن آپس میں ٹکرانے لگیں گے۔ اس وقت کوئی بوڑھا آدمی حقے کے کش لیتا اپنے مکان کے تھڑے پر آ بیٹھے گا۔ اور مشتبہ نظروں سے آپ کی طرف دیکھے گا۔ اور آپ اس کی تیز نگاہی کی تاب نہ لا کر آہستہ آہستہ کھسکنے لگیں گے۔ میں اس سے ہڈیوں کا یہ پنجر جس سے مجھے والہانہ پیار ہے۔ اپنے پھولوں کو آخری بار پیار بھری نظروں سے دیکھے گا۔ اور جس خاموشی سے باہر نکلا تھا۔ اسی خاموشی سے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر چلا جائے گا۔ اس کے بعد دیر تک پردے کے پیچھے سے تُو تُو۔ میں میں کی آوازیں آتی رہیں گی ــــ مگر یہ ایک الگ داستان ہے!

مجھے ہڈیوں کے اس ڈھانچے سے والہانہ پیار ہے۔ اور میں ہر صبح کی میٹھی نیند سے محض اس لئے دست بردار ہو جاتا ہوں تاکہ اس "عجوبۂ فطرت" کو پھولوں کے کُنج میں بھنورے کی طرح پھرتے ہوئے دیکھ سکوں اور یہ منظر بھی عجیب ہوتا ہے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا چبوترے کے قریب آ جاتا ہوں اور کل کی طرح پھٹے ہوئے ایک انسانی پنجر کو بڑے غور سے دیکھنے لگتا ہوں۔ کبھی کبھی کسی شوخ چشم پھول سے متاثر ہو کر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوں تاکہ اسے توڑ سکوں۔ لیکن ابھی یہ ہاتھ پھول سے دور ہی ہوتا ہے کہ میرے دوست کی قہر آلود نظریں ایک برقی رو کی طرح بڑھ کر اس ہاتھ کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ اور یہ ہوا میں معلق ہو کر رہ جاتا ہے پرانی کرم خوردہ کتابوں کے جادوگر بھی شاید ایسے ہی سیاہ فام ڈھانچے ہوں گے۔ جو پھول ایسی شہزادیوں کو دیووں کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لئے

جادو سے کام لیتے تھے۔ بہرحال میں اس کالے جادو کی تیز نگاہی کی تاب نہ لا کر ہاتھ کھینچ لیتا ہوں اور پھولوں میں دلچسپی لیتے ہوئے اپنے دوست سے پوچھتا ہوں ـــــ "یار! بتا تو ان پھولوں کے کیا نام ہیں؟" یک لخت جیسے کسی ستار کے تار کھنچ جائیں، میرے دوست کی پتلیاں سکڑ کر لمبی ہو جاتی ہیں۔ اور ان پتلیوں سے شعلے سے نکلنے لگتے ہیں۔ اور وہ فوارے کو زمین پہ رکھ کر غصے سے تھرانے لگتا ہے۔ پھر جب اُسے یقین آجاتا ہے کہ میں اس کا دوست ہوں کوئی غیر نہیں ہوں تو بڑی آہستگی اور معصومیت سے جواب دیتا ہے ـــــ "پھول" پھول ہے۔ کبھی پھول کا بھی کوئی نام ہوتا ہے بھلا ـــــ دفعتاً خفت کا بادل میری ذات پر چھا جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے گملوں کے سارے پھول یک لخت کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں۔ اور میرے دوست کی آنکھوں میں تمسخر ناچنے لگا ہے۔ اس وقت میں اس معصوم مخلوق سے اپنی آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ اور بھاگ کر اپنی کوٹھری میں آجاتا ہوں۔

پھر جب خفت کے بادل چھٹنے لگتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ اس ہڈیوں کے پنجر نے کیسی سچی بات کہہ دی ہے۔ واقعتاً پھولوں کے نام رکھنا بدمذاقی کے سوا اور کچھ نہیں۔ فطرت کا ذوقِ نمو ہزاروں لاکھوں پودوں کو زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلنے کی ترغیب دیتا ہے اور اگرچہ فطرت ان پودوں کو تنوع بخشنے میں بخل سے کام نہیں لیتی۔ تاہم ایسا کبھی نہیں ہوا کہ فطرت نے ان پودوں کی پیشانیوں پر ان کے نام بھی کندہ کر دیئے ہوں۔ فطرت کے دربار میں پودا، پرندہ، انسان ـــــ غرضیکہ ہر ذی روح "نام" سے بے نیاز ہے۔ اُس جھکی ہوئی نازک شاخ پر بیٹھی اس خوبصورت سی سنہری چڑیا کا کیا نام ہے۔ اور اس جیسی ہزاروں نازک اور سنہری چڑیوں کے نام کیا ہیں۔ فطرت نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ تفریق اور تقسیم کے مصنوعی عمل سے کام لے۔ یہ تو انسان کا کارنامہ ہے کہ وہ محض اپنی سہولت کی خاطر ان نازک پرندوں، پھولوں اور بچوں کو نام عطا کر کے ان کے حسن، معصومیت اور پاکیزگی کو داغدار کر دیتا ہے۔ ننھی اور رسیلی آواز والی شب رنگ چڑیا کو کوئل، سرخ، زرد اور سفید رنگوں والے چاندی کے ورق ایسے پھولوں کو پاپوجا کا اور گھونگھر یالے بالوں، سیب کی طرح سرخ گالوں اور چشمے کی طرح شفاف آنکھوں والے بچے کو جو رجان کا نام دے کر بدذاتی، تصنع اور فریب کی منہ بولتی تصویر بن جاتا ہے۔ اور پھر اس پر فخر کرتا ہے کہ اس نے ہر ذی روح کو موت سے قبل نمبروں اور ناموں اور صورت کے کتبوں اور قبروں میں مقید کر لیا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے!

پھر جب خفت کے بادل بالکل چھٹ جاتے ہیں۔ اور مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ تو میں سوچتا ہوں کہ پھول کو نام عطا کرنا ہی نہیں اسے توڑنا بھی بدمذاقی کی دلیل ہے۔ اردو شاعری میں گلچیں یونہی بدنام نہیں۔ شاعر حضرات چونکہ حساس ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ اپنے کلام میں پھول توڑنے کی مذمت کرتے ہیں اور کم سے کم اس میدان میں تو ان کی سماجی حیثیت سے انکار ناممکن ہے۔ بے شک وہ کبھی کبھی "آیے خانہ برانداز چمن" کا ورد کرتے ہوئے پھولوں کا تحفہ قبول کرنے کے لئے انتہائی عامیانہ اندازِ تکلم اختیار کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ پھول توڑنے کے بھی مرتکب ہوئے ہیں۔ پھول تو شاخ پر ہی اچھا لگتا ہے۔ اور اسے وہاں ہی اپنی عمر عزیز کاٹ لینے کی اجازت ملنی چاہیئے۔ اور پھر اس کی عمر عزیز ہوتی بھی کیا ہے؟ جو پھول صبح کو کھلتا ہے وہ شاید ہی شام تک زندہ رہتا ہے۔ مگر ان چند گھنٹوں میں یہ ننھا سا پیدا اسا مسافر زندگی کی تمام منازل سے گذرتا اور کائنات کی دلفریب قوس کو نہایت خوبصورتی سے جنم دے دیتا ہے۔ منہ اندھیرے جب نسیم صبح کا پاگل جھونکا اٹکھیلیاں کرتا باغ سے گذرتا ہے تو آدھ کھلے پھول کی آنکھوں میں ننھے ننھے آبدار موتیوں کو دیکھ کر چونک اٹھتا ہے۔ یہ پھول کا بچپن ہے! پھر جب سورج سوا نیزے پہ آجاتا ہے تو اسی جھونکے کا لمس پھول کو کھلکھلا کر ہنس دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور پھول کی پتیاں ایک عجیب شرارت بھرے انداز میں کھلنے اور بند ہونے لگتی ہیں۔ یہ پھول کا لڑکپن ہے! دوپہر تک پھول پوری طرح کھل جاتا ہے۔ اور اس کے ہر بن مُو سے ایک پاگل کر دینے والی خوشبو نکل کر کالے کالے لاتعداد بھونروں کو بے تاب کر دیتی ہے۔ یہ پھول کی جوانی ہے! دوپہر ڈھلتے ہی پھول کا بدن کسی چلدار شاخ کی طرح، کسی بھرپور عورت کی مانند اپنے ہی بار سے جھکنے لگتا ہے۔ یہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہے! شام کا منظر دیکھنے کی مجھے تاب نہیں۔ فرشِ خاک پر بکھری ہوئی پتیاں، حسین یادوں کی طرح ہوا کے ہر جھونکے پر اپنا سر

اٹھاتی ہیں۔ اور جب آنے والا نہیں آتا تو گھٹنوں پر سر رکھے تا دیر گم سُم رہتی ہے۔ یہ پھول کا انجام ہے!۔

پھول کی اس حیاتِ مختصر اور اس عظیم کارکردگی سے قطع نظر کر کے جب کوئی بدذوق اسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگانے لگتا ہے۔ تو میں اپنے بال نوچ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب وہ باز نہیں آتا تو اپنے سیہ فام جادوگر کو آواز دیتا ہوں۔ تاکہ وہ ایک ہی قہر آلود نظر سے گلچیں کے بڑھتے ہوئے ہات کو مفلوج کر دے۔ مگر میری بدنصیبی کہ میں اس وقت میرا یہ دوست ناٹے کے پردے کے پیچھے خود کسی گلچیں کے بڑھتے ہوئے ہات کی زد میں ہوتا ہے۔ افسوس!!۔

○

"ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصنافِ ادب سے ممیز کرتی ہے اس کا غیر رسمی طریقِ کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیشِ نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لئے وہ دلائل و براہین سے کام لے۔ انشائیہ کی ایک اور خصوصیت اس کی عدم تکمیل ہے۔ ایک مقالہ لکھتے وقت جہاں یہ ضروری ہے کہ موضوع زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے وہاں انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم ہوتی ہے۔ لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کر دی جاتی ہیں جن کا بظاہر موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یوں تو تازگی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے بغیر کوئی بھی صنفِ ادب فن کے اعلیٰ مدارج تک نہیں پہنچ سکتی تاہم انشائیہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں تازگی کا نہ صرف سب سے زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے بلکہ جس کی ذرا سی کمی بھی انشائیہ کو اُس کے فنی مقام سے نیچے گرا دیتی ہے۔"

("انشائیہ کیا ہے"

خیال پارے)

○

عابد سہیل

آبگینے

چکردار دروازہ سے پارک کے وسط میں لان تک دو رویہ جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان جھنڈیوں کے درمیان کہیں کہیں غبارے بھی لٹک رہے تھے۔ رنگین اور خوبصورت غبارے۔ پارک کے ایک کونہ میں کچھ بچے گیند بلا کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف محلّہ کے چھوٹے بچوں کی ریس ہو رہی تھی۔ ان بچوں نے اپنے جوتوں سے ایک سیدھی لائن بنا دی تھی۔ اسی جگہ سے وہ دوڑتے اور سامنے مہندی کی روش کو سب سے پہلے چھونے والا اوّل آتا لیکن سب سے پہلے مہندی کو کس نے چھوا، اس بارے میں تقریباً ہر بار جھگڑا ہوتا "واہ جی واہ، خوب رہی، پہلے ہم نے چھوا اور پہلے ہیں بڑے آپ فسٹ آنے والے" معصوم پاروتی نے شانے سے کمر تک اپنا دوپٹہ آڑا آڑا باندھ رکھا تھا۔ ایاز کی طرف غصّہ سے دیکھ کے کہتی۔ ایاز بھی اپنی بات پر اڑا رہتا لیکن تھوڑی ہی دیر میں ان بچوں میں سمجھوتہ ہو جاتا اور پھر ریس شروع ہو جاتی۔

یہ پارک جو اب کافی خوبصورت اور سرسبز ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں پہلے تک یوں ہی سا تھا۔ پرنئے مالی کے آنے کے بعد اس کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ اب پگڈنڈیوں کے دونوں طرف سدابہار کے پودے بھی لگ گئے تھے اور بچوں کی جو پہلے آزادانہ کیاریاں خراب کیا کرتے تھے۔ روک ٹوک بھی ہونے لگی تھی۔ نئے مالی کا بس چلتا تو وہ آج بھی پارک میں اتنی بھیڑ کی اجازت نہ دیتا لیکن اس کا بس چلتا جب نا۔

لان کے اس حصّے پر جہاں بچے گیند بلا کھیل رہے تھے کسی نے ایک میز لا کر رکھ دی، پھر اس پر ایک خوبصورت سا میز پوش ڈال دیا گیا۔ کچھ بچے کرسیاں لے آئے اور پھر کسی نے کھجور کے درخت پر چڑھ کر لاؤڈ سپیکر لگا دیا اور ریکارڈنگ شروع ہو گئی 'میرا لال دوپٹہ ململ کا — زندگی پھر نہیں بھولے گی یہ برسات کی رات —' ریکارڈنگ شروع ہونا ہی تھی کہ بچے کھیل کود چھوڑ کر جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد چکردار دروازہ کی طرف سے ایک صاحب کئی لوگوں کے ساتھ آئے اور ریکارڈنگ ختم کر دی گئی۔ اسی بھیڑ میں سے کچھ بچے ایک ساتھ نمودار ہوئے اور انہوں نے مل کر گایا "جن گن من —" سب کھڑے ہو گئے۔ پھر سب بچوں نے تالیاں بجائیں، اور معزز مہمان نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ بچوں میں انگریزی مٹھائی بانٹی گئی اور فلمی گانوں کی ریکارڈنگ پھر شروع ہو گئی — "تم چودھویں کا چاند ہو یا ——"

پارک سے ملحق مکان کے اوپری حصّے سے آٹھ نو برس کی ایک لڑکی سُرخ پھولدار اسکرٹ پہنے زینہ سے آہستہ آہستہ اتری۔ بارش ابھی ہو کر کھُل گئی تھی۔ تیز ہوا کا جھونکا آیا تو اس کی اسکرٹ کا دامن پھڑپھڑایا، لہرایا، اور پھر وہ خود لہرائی۔

"چچا ——" اس نے بڑے چاؤ سے کہا

"ہوں — " چچا نے جو نیچے کے کمرہ میں اکیلے ہی رہتے تھے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر ہی جواب دیا "کیا ہے —؟"

"چچا آپ آزادی نہیں منا رہے ہیں —؟"

"منا تو رہا ہوں —"

"واہ! آپ نے خوب اچھے سے کپڑے تو پہنے ہی نہیں۔"

اب چچا نے کتاب سرہانے رکھ دی اور نگہت پروین کی طرف جسے سب پیار سے پارو کہتے تھے دیکھا اور مسکرا کر بولے "تمہارے ایسے رنگین کپڑے تو میرے پاس ہیں نہیں۔"

پھر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد چچا نے کہا

"کہاں جانے کی تیاریاں ہیں، بھئی یہ ربن ہمیں دے دو۔"

"اسکول ——" پارو نے جملے کے دوسرے حصہ کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی اور اپنے بنفشئی رنگ کے ربن کو جس پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھول بنے ہوئے تھے انگلی کے گرد لپیٹنے لگی۔ پھر اس نے دونوں ٹانگیں اٹھا کر سامنے والی چھوٹی میز پر رکھ دیں۔ اور بولی

"چچا آپ نے بتایا نہیں۔"

"کیا نہیں بتایا؟"

"آپ سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟"

"ہوں!"

"نہیں، ابھی بتائیے۔ آپ ہمیشہ ٹال جاتے ہیں۔"

"اور اگر پانی برس گیا تو اسکول کیسے جاؤ گی؟" چچا نے پارو کو دوسری طرف متوجہ کرنا چاہا۔

"سمجھ گئی سمجھ گئی" پارو نے زور سے تالی بجائی "آپ مجھے ٹال رہے ہیں۔ بتائیے آپ سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟"

"اچھا کل ضرور بتاؤں گا۔"

"تو کل میں بھی سگریٹ پیوں گی" پارو نے اپنی ٹانگیں میز پر سے نیچے رکھ لیں اور سامنے رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکالی۔

"پارو ——" چچا نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"تو آپ بتاتے کیوں نہیں؟"

"دیکھو پارو اصل میں بچے سگریٹ نہیں پیتے۔"

چچا نے یہ جملہ نہایت دھیرے دھیرے رک رک کر کہا تاکہ پارو اس کے بعد کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ انہوں نے جیسے اپنے خیال میں بات ختم کر دی ہے، سرہانے رکھی ہوئی کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن پارو بھلا ماننے والی تھی۔ بولی

"تو اب میں بچہ کہاں ہوں؟"

چچا پارو کے اس جواب پر تھوڑے سے جھنجھلا گئے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پا لیا اور بولے

"لڑکیاں نہیں پیتیں" انہوں نے دوسرا داؤں آزمایا۔

"کیوں نہیں پیتیں؟"

"تیری کیوں کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔"

"تو میں ضرور سگریٹ پیوں گی —— چچا میں ضرور پیوں گی، ہم سب برابر ہیں۔"

جملے کے آخری حصہ پر چچا چونک پڑے۔ یہ خیال، یہ بات پارو کے منہ سے کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ لیکن جونہی ان کی سمجھ میں آگیا کہ پارو نے یہ جملہ کس جگہ سے اٹھا کر اپنی زبان پر رکھ لیا تھا ان کا سارا استعجاب غائب ہوگیا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل پارک میں کی ہوئی تقریر کا یہ جملہ پارو نے اپنے مطلب کے لئے استعمال کر لیا تھا۔ لیکن اس دلیل کا جواب کیا تھا۔ اس کی کاٹ کیا تھی۔ کوئی ایسی ہی بات کہنا چاہئے جو پارو کی سمجھ میں بھی آجائے اور تلوار کی سی تیزی سے اس کی دلیل کو کاٹ بھی دے۔ آخر بولے ——

"اچھا تو نہ ہم تمہارے چچا اور نہ تم ہماری بھتیجی۔"

"کیوں —— ؟" پارو حیران تھی کہ اس کی بات کا یہ نتیجہ کہاں سے نکل آیا۔

"وہ کیا —— جب ہم تم، سب برابر ہیں تو تم ہماری بھتیجی کیسے ہوئیں۔"

پارو چکرا گئی۔ پھر بولی

"یہ بات ہے چچا —— میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ عید پہ ہمیں موٹر خرید کے دینے سے بچنا چاہتے ہیں۔ سچ چچا۔ اب کے آپ نے موٹر نہیں دی تو میں امتحان بالکل پاس نہیں کروں گی۔ جان بوجھ کے فیل ہوجاؤں گی۔ کتنے دنوں سے ٹال رہے ہیں ——"

ابھی پارو کچھ اور کہنے کے لئے منہ کھول ہی رہی تھی کہ ایک دم بارش ہونے لگی۔ صبح ہلکے چھینٹے پڑے تھے جس سے سردی ذرا سی چمک گئی تھی۔ پھر آسمان ذرا کھل گیا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد دوبارہ بادل گھر گئے اور اب تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور پانی کا چھینٹا کمرہ کے اندر تک آگیا۔ چچا نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور بجلی جلا دی۔

"پارو بٹیا —— پارو بٹیا ——" باہر سے بچوں کو اسکول لے جانے والی بوا کی آواز آئی۔

"آئی بوا ——" پارو نے جواب دیا۔

پارو مشکل کرسی پر سے اٹھی ہی تھی کہ بوا آکر کمرے سے زینے میں کھلنے والے دروازہ پر آکر کھڑی ہوگئی۔ پانی میں تقریباً شرابور۔

"کیسے اسکول چلوگی۔ بھیگ جاؤ گی بٹیا۔"

"نہیں، میں تو جاؤں گی۔" پارو ٹھنٹھنائی۔

"بھیگ جاؤ گی پارو۔" چچا نے ذرا پیار سے پارو کو روکا۔

"نہیں چچا میں ضرور جاؤں گی۔ اسکول میں جھنڈا لہرایا جائے گا۔"

"جھنڈا پارک میں لہرا تو لیا اور مٹھائی بھی کھالی۔" چچا نے بہلانے کی کوشش کی۔

"نہیں چچا، اسکول میں وہ جو گانا گایا جائے گا نا ——" پارو نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے "سارے جہاں سے اچھا —— وہ مجھی کو گانا ہے۔"

"پارو —— اسکول مت جاؤ بھیگ جاؤ گی۔" زینہ کے پاس سے پارو کی ماں نے کہا۔ "ابھی بخار سے اٹھی ہو پھر پڑ رہو گی تو ——"

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔" بوا نے اپنی بات دہرائی۔

"ارشد صاحب رو گئے۔" پارو کی ماں نے اب چچا کو مخاطب کیا "نہیں تو بیمار پڑی تو آپ ہی کے کمرہ میں بستر بچھوا دوں گی۔

سارا پڑھنا لکھنا دھرا رہ جائے گا۔"

"پارو نے منہ بنایا، منمنائی، کسمسائی، پھر زور سے پیر زمین پر مار کر بولی "اب اسکول نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی، کبھی نہیں جاؤں گی۔"

تھوڑی دیر تک پارو چچا کے کمرے میں کھڑی منہ بسورتی رہی۔ پھر چپ چاپ اوپر کوٹھے پر چلی گئی

چچا نے کتاب اٹھائی اور پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی۔ تقریباً دو گھنٹہ بعد جب ان کی آنکھ کھلی تو آسمان صاف ہو چکا تھا اور باہر سورج چمک رہا تھا۔ اور زینہ پر سے کوئی زور زور سے اُتر رہا تھا۔ شاید اسی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"پارو ــــ" ذرا دور سے آواز آئی۔ "تم اسکول نہیں گئیں" یہ پولو کی آواز تھی۔

گلی کے کنارے نکڑ پر ایک ہلکے سرمئی رنگ کی کار کھڑی تھی۔ پولو اسی کار سے اُترا تھا۔ نیلا پُل اوور اور نیلی ہیٹ پہنے گورا تازہ پولو تیز تیز قدم بڑھاتا چلا آرہا تھا۔ دو چار قدم چلنے کے بعد وہ اپنے سر کو اس طرح جنبش دیتا کہ پیشانی کے بال پیچھے جا گرتے۔ جب وہ قریب آیا تو پارو نے پوچھا

"اسکول گئے تھے؟"

"ہاں، بڑا مزا آیا۔ خوب کھیل ہوئے۔ تم نہیں گئیں؟"

"امی نے جانے ہی نہیں دیا پولو۔ بارش ہو رہی تھی نا!"

"تو تم بھی کار خرید کیوں نہیں لیتیں" پولو نے کہا۔

"ابو کہتے ہیں آج کل موٹریں آ ہی نہیں رہی ہیں" پارو اسی طرح زینہ پر کھڑی کھڑی اپنی فراک کے دامن کو انگلی سے مروڑتی ہوئی بولی۔

"میں دلوا دوں جتنی کہو، تمہارے ابو نے بہانہ بنا دیا ہوگا" پولو نے کہا۔ "میرے ڈیڈی تو کہہ رہے تھے یہ کار بیچ کر نئی ماڈل خریدیں گے۔"

"اچھا ــــ کھیلنے نہیں آؤ گے؟"

"نہیں، آج ہم لوگ سینما دیکھنے جا رہے ہیں۔ تم نہیں گئیں سینما دیکھنے" پولو نے کہا اور اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔

پارو اب زینہ سے اتر کر پارک کے جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر پارک میں کھیلنے والے بچوں کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک طرف سے نجمہ، سلمیٰ اور عذرا آگئیں۔ تینوں اس کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔

نجمہ نے پوچھا

"تم اسکول گئی تھیں پارو؟"

"نہیں، پانی جو برس رہا تھا" پارو نے منہ بنا کر کہا۔

"اور ہم بھی نہیں گئے" عذرا بولی "کون جاتا پانی کیچڑ میں۔ محلہ سے تو کوئی بھی نہیں گیا۔ بوا کہہ رہی تھیں۔ سن رہی ہو رشیدہ کوئی نہیں جا رہا ہے"

"اور ایسے پانی میں مزا بھی کیا آیا ہوگا؟" نجمہ نے کہا

"واہ، پولو کے اسکول میں تو خوب کھیل ہوئے" پارو نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"کھیل کیا خاک ہوئے ہوں گے۔ پانی تو برس رہا تھا" سلمیٰ بولی۔

"پولو ہی کہہ رہا تھا" پارو نے اپنے خیال میں بات ختم کردی۔

"شیخی بگھار رہا ہوگا" نجمہ بولی "ٹائی باندھ کے کیسا اکڑا اکڑ کے چلتا ہے۔ صبح میں نے کہا آؤ پولو کوڑا جمال شاہی کھیلیں تو بولا مجھے اسکول جانا ہے۔ میں نے کہا، پانی میں اسکول کیسے جاؤ گے؟ تو بولا میرے پاس تو کار ہے، کوئی پیدل تھوڑی جاؤں گا ہم نے تو بھیا اس سے کُٹی کرلی۔"

اتنے میں پولو کپڑے بدل کے اپنے مکان سے باہر نکلا۔ نجمہ، سلی وغیرہ کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا "آؤ نجمہ کوڑا جمال شاہی کھیلیں"

"نہیں بھیا ہم نہیں کھیلتے" نجمہ نے بے رُخی سے جواب دیا۔

"تم تو سنیما دیکھنے جا رہے تھے؟" پارو نے پوچھا

"سوچا نال جائیں" پولو نے اپنے جوتے کی نوک سے زمین کریدتے ہوئے کہا۔ پھر بولا "پارو تم نے میرا پریذیڈنٹ دیکھا۔ انکل نے پیرس سے بھیجا ہے — پورا کا پورا مکان ہے۔ جب دروازہ کھولو تو ایسے مزے کی آواز آتی ہے ٹن ٹن — ٹن — ٹن —"

"ہم نہیں دیکھتے" نجمہ نے کہا "ہم اپنا کھیل کھیلنے جا رہے ہیں"

"مت کھیلو" پولو نے جواب دیا اور پارک کی طرف چل دیا۔

"دیکھا تم نے، شیخی ماری تھی کہ سنیما دیکھنے جا رہا ہوں، کیسا شیخی خورہ ہے" نجمہ بولی "بھیا ہم تو اب نہیں بولیں گے۔ پارو تم بھی نہ بولنا سب مل کر کُٹی کرلیں"

"اور جو بولے اس سے بھی کُٹی" آخر پارو بھی جو تھوڑی دیر سے خاموش تھی بول اٹھی "بڑے آئے موٹر والے۔ ان کی موٹر انہیں کو مبارک —"

نجمہ نے پارک کی طرف جاتے ہوئے پولو کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا

"کیسا بن بن کے چل رہا ہے"

"اللہ کرے موٹر دیوار سے ٹکرا جائے۔ ساری شیخی نکل جائے" پارو بولی۔

"پارو —" چچا نے جو کمرہ سے بچوں کی باتیں سن رہے تھے آواز دی اور سب بچے ایک دم چپ ہو گئے اور پارو چپ چاپ زینہ کا دروازہ کھول کر اندر کمرہ میں جا کھڑی ہوئی۔

"جی چچا — ؟؟"

"پارو — !" چچا نے غصہ سے کہا۔ پھر ایک دم خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بولے

"جاؤ کھیلو —"

نوخیز کلیوں میں ایسے خزاں رسیدہ خیالات نے انہیں بے زبان کر دیا تھا۔

○

کرشن کانت

روشنی اور آواز

اس مکان کی تین کھڑکیاں اور ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اور اس وقت چاروں بند تھے۔ بھوپندر نے اپنی پریشان نگاہیں ساری گلی میں دوڑائیں مگر اُسے کوئی نظر نہ آیا۔ اس چلچلاتی دھوپ میں باہر نکل کر لوگ بیٹھ بھی کیا، اس کی اپنی گلی میں لوگ دوپہر کو ایک پرانے برگد کے نیچے بیٹھ جاتے اور چوپڑ کی بازی پر وہ ہاؤ ہو مچتی کہ کسی شریف آدمی کا کھانے کے بعد کروٹ لینا مشکل ہو جاتا۔ چوپڑ اٹھتی تو آوارہ بچے گلی پر قبضہ کر لیتے اور غلیظ گالیاں، مار پیٹ اور بک جھک کا بازار گرم ہو جاتا اور جب تک بچوں کے والدین کھانے اور سونے کے لئے انہیں گھر نہ بلا لیتے، گلی میں یہی دھما چوکڑی مچی رہتی۔

بھوپندر کے دونوں لڑکے پانچ بجے سکول سے لوٹتے تھے۔ اُس کے دفتر سے آنے کا بھی یہی وقت تھا۔ اس کی بیوی صرف چھ مہینے پہلے انتقال کر گئی تھی۔ اور اُسے ایسے محسوس ہو رہا تھا، جیسے کسی نے اُسے ایک اندھے کنوئیں میں گرا دیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں کرے، سینما جا کر یا کسی اور تفریح سے اپنا دل بہلائے۔ مگر بچوں کا کیا کرتا؛ پانچ بجتے ہی دفتر سے بھاگتا، مبادا رمیش اور پریش گلی کے لڑکوں کے ساتھ غلیظ گالیاں اور دوسری بد عادتیں اختیار کر لیں۔ ابھی پچھلے دنوں اس نے ایک انگریزی رسالہ میں ٹیڈی لوائز TADY BOYS کے بارے میں مضامین کا ایک سلسلہ پڑھا تھا۔ یہ وہ لڑکے تھے جو ماں باپ کی ناچاقی، ماں یا باپ کی بے وقت موت، یا جب لاڈ پیار یا غفلت کے باعث بری علتیں اپنا چکے تھے۔ اور پھر نہ صرف اپنی ذات کے لئے بلکہ سارے سماج کے لئے ایک مستقل لعنت بن گئے تھے۔ پھر اس نے دفتر کی لائبریری سے ایک کتاب نکلوائی جس کا عنوان تھا بُرے گھر۔ اور اس میں مجرموں کی تفصیلی روئدادیں پڑھ پڑھ کر وہ پریشان ہوتا رہا۔ مکان بدلنے کے بارے میں کئی بار ارادہ کیا مگر کسی شریف محلے میں ایک رنڈوے کو مکان ملتا ہی کہاں تھا، اور اگر ملتا بھی تو مالک مکان کرایہ اتنا سنا دیتا کہ اسے نمسکار کے سوا اور کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔

مگر اس گلی میں نہ کہیں چوپڑ ہو رہی تھی اور نہ بچے کھیل رہے تھے۔ تین دن کے لگاتار تقاضے کے بعد آج سپرنٹنڈنٹ نے اُسے ایک گھنٹے کی چھٹی دی تھی۔ اگلے روز اتوار تھا۔ مگر اس دن اس کو بچوں کے ساتھ ایک دوست کے ہاں کھانے پر جانا تھا۔ دفتر سے فارغ ہو کر بازار سے سبزی اور دیگر اشیا لانے کے علاوہ گائے کے لئے چارہ لانے پانچ میل دور جانا پڑتا تھا۔ کھانا پکانا پڑتا تھا۔ بچوں کو پڑھانا پڑتا تھا اور جب تک انہیں نیند نہ آ جاتی کوئی قصہ کہانی سنا کر ان کا جی بہلانا پڑتا تھا —— اس کے پاس اور وقت ہی کہاں تھا؛

بھوپندر نے گلی کے اگلے سرے تک ایک اور نگاہ دوڑائی۔ ایک بچہ ایک ہاتھ میں اکنی اور دوسرے میں پیتل کی کٹوری پکڑے بھاگتا آ رہا تھا۔ بھوپندر نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ مگر بچے نے اس سے متعارف ہونے سے انکار کر دیا اور کترا کر بازار کی طرف بھاگ گیا۔ پھر نائیلن کی ساڑھی پہنے ایک عورت آئی جو چلتے چلتے اپنی ساڑھی کی تہوں کو ملاحظہ بھی کر رہی تھی۔ بھوپندر جرأت کرنے پر تیار ہو گیا۔ لیکن جب

وہ عورت اُس کے پاس پہنچی تو وہ اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ عورت اُسے عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی اور مکان کی تین کھڑکیاں اور ایک دروازہ بدستور بند تھا۔

آخر اُس نے جرأت کر کے دروازے کو دھکیل دیا۔ پرانی قطع کے پٹ چرمرا کر کھل گئے اور اندر سے ہش ہش کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر بھوپندر نے اپنی جرأت میں مزید اضافہ کیا اور ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ اندر سے پھر ہش ہش کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی نے پکارا "— کون ؟ ؟"

"میں ہوں بھوپندر!" اُس نے جواب دیا۔

"اندر چلے آئیے" پھر آواز آئی۔

"مگر کہاں ؟" بھوپندر جھجک کر رہ گیا۔ ڈیوڑھی کے ساتھ ایک ڈرائنگ روم تھا جس کی تین کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ مگر باہر دھوپ میں دیر تک کھڑا رہنے کی وجہ سے کمرے میں گہرے اندھیرے کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اندر چلے آئیے!" پھر آواز آئی۔ "میں اِدھر ہی ہوں۔"

اور بھوپندر نے تاریکی میں قدم رکھ ہی دیا۔

"بیٹھ جائیے!" پھر آواز آئی۔

اور بھوپندر نے اپنی نگاہوں کو ذرا بھینچ کر دیکھا تو اُسے ایک کرسی نظر آئی جس کی پشت ٹوٹ چکی تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیسے اُسے ڈر تھا کہ کرسی اس کے بوجھ کے نیچے کچل جائے گی۔

"بہت اندھیرا ہے یہاں!" اُس نے کہا۔

"کھڑکی کھول لیجئے۔" آواز نے مشورہ دیا۔ "آپ کے دائیں طرف ہے۔"

بھوپندر جیسے جرأت کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی انگلیوں سے کھڑکی کی تلاش کی۔ جیسے اندھے طالب علم خلا میں دیکھتے ہوئے بریل اسلوب میں لکھی کتاب پڑھتے ہیں۔ اور پھر ایک دم کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ جیسے وہ کمرے کی ساری تاریکی کو باہر نکال دینے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا اور تاریکی ایک دم بھاگ گئی۔ اس نے دیکھا کمرے کے کونے میں ایک آدمی ہاتھ میں رسالہ لئے آدھا لیٹا آدھا بیٹھا ہوا تھا۔ فرش پر کچھ کتابیں، رسالے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ کھونٹیوں پر بے انداز غلیظ کپڑے رونی صورت بنائے لٹک رہے تھے۔ اور وہ آدمی مسکرا رہا تھا۔ جیسے روشنی کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔

"آپ یہاں رہتے ہیں؟" اس کے اس استفسار میں حیرانی کا عنصر غالب تھا۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ آدمی پھر مسکرایا۔ "میں یہیں رہتا ہوں، اسی تاریکی اور خاموشی میں، اکیلا اداس!! پھر کبھی کبھی کوئی باہر سے آ جاتا ہے اور کھڑکی کھول کر مجھے چند لمحوں کے لئے روشنی اور آواز دے جاتا ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا اور مسکرا کر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا۔ بھوپندر کو محسوس ہوا جیسے وہ اس دُنیا کی نہیں بلکہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہے۔

"بچپن میں ایک قصہ پڑھا تھا۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ایک دیو کسی شہزادی کو بھگا لے گیا اور سمندر کی گہرائیوں میں اپنے مونگے کے محل میں اسے قید کر دیا۔ شہزادی محل کی تاریکی اور خاموشی میں نہ جانے کتنے سال قید رہی۔ پھر ایک شہزادے نے اُسے خواب میں دیکھا کئی قسم کے مصائب جھیلنے کے بعد وہ مونگے کے محل تک پہنچا اور شہزادی کو تاریکی اور خاموشی کی قید سے نجات دلانے میں کامیاب ہو گیا۔"

وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ بھوپندر نے دیکھا اُس کے سر پر بال بہت کم تھے اور گول گندمی چہرے پر مسکراہٹ کے وقت کچھ سلوٹیں نمایاں ہو جاتی تھیں۔ جن سے فہم و فراست جھلکنے لگتی تھی۔

"میں ہر وقت کسی ایسے شہزادے کا منتظر رہتا ہوں" وہ پھر مسکرانے لگا "اور اس وقت آپ ہی میرے مسیحا ہیں۔" وہ شہزادی کا قصہ چھوڑ کر حضرت عیسیٰ کی طرف آگیا۔

"لیکن آپ ان کھڑکیوں کو کھلا کیوں نہیں رکھتے؟" بھوپندر نے بات سنبھالی "روشنی اور ہوا سے آپ کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔"

"مگر یہاں روشنی تیز ہے اور ہوا گرم" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کے چہرے پر نئے خطوط گہرے ہوگئے تھے۔ جیسے اُس کی بات میں کوئی گہرا فلسفہ تھا۔

"ایک ہی کھڑکی کھلی رکھا کیجئے" بھوپندر نے فضول مشورہ دیا "بند رہنے سے کمرے کی ہوا غلیظ ہو جاتی ہے اور اس سے پھیپھڑوں کو نقصان پہنچتا ہے۔"

"مگر پھر اس کھڑکی کو بند کون کرے گا؟" وہ پوچھنے لگا۔

"اگر آپ خود ہی یہ کام کر لیا کریں، تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔"

"حرج ہے" وہ کہنے لگا "صرف یہ ہے کہ اس میں چوٹ لگنے کا خطرہ ہے۔"

بھوپندر سٹ پٹا گیا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی تو نہیں آرہا تھا۔ بار بار پوچھنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ جیسے غالب کے کسی شعر میں فارسی کی ایک طویل ترکیب پھنس گئی ہو۔

"معاف کیجئے" وہ آدمی کہنے لگا "مجھے یہ پوچھنا تو یاد ہی نہیں رہا کہ آپ کس غرض سے یہاں تشریف لائے ہیں۔"

لیکن بھوپندر ابھی تک سمندر کی گہرائیوں میں مونگے کے محل کی تلاش کر رہا تھا، جہاں ایک تاریک کمرے میں شہزادی قید تھی اور دوسرے میں ایک طوطا جس کے اندر دیو کی روح تھی اور محل کے باہر سینکڑوں شہزادے بچھو، مگرمچھ اور سانپ کی صورتیں اختیار کئے دیو کے طلسم سے اُس محل کی نگہبانی کر رہے تھے اور کسی بہادر شہزادے کا انتظار کر رہے تھے، جو......

"جی!" وہ اپنے تصور سے جاگا "بات دراصل یہ ہے کہ آج سے چھ مہینے پہلے میری بیوی کا دیہانت...."

"آپ کی بیوی مرگئی؟" اُس نے پھر ایک طویل قہقہہ لگایا "چلو، یہ بھی اچھا ہوا۔"

بھوپندر بالکل سٹ پٹا گیا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اُس آدمی نے اپنا سوال دہرایا "کہئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں! وہ...... وہ پالی جی سے آپ کا ذکر کیا تھا" بھوپندر نے ہراس یافتہ انداز میں کہا "آپ بچوں کو پڑھاتے ہیں؟"

"پڑھاتا تو نہیں ہوں" وہ کہنے لگا "پڑھانا چاہتا ہوں۔ ویسے میں کوئی معلم نہیں ہوں اور نہ مجھ میں معلمی کی کوئی ایسی صلاحیت ہے جس کے اظہار کے لئے میں بے قرار ہو جاؤں۔ مجھے تو روشنی کی ضرورت ہے بھوپندر صاحب! اور آواز کی۔"

"لیکن معاف کیجئے گا" بھوپندر نے جھلا کر کہا "مجھے اپنے بچوں کی تعلیم کی ضرورت ہے، ان کے مستقبل کی فکر ہے۔"

"انہیں تعلیم ملے گی" اس نے کہا "اور اس سے مجھے روشنی مل جائے گی اور آواز بھی۔"

وہ کچھ لمحے پھر خاموش رہا، پھر کہنے لگا "آپ گھبرائیے نہیں۔ آپ کو اپنے بچوں کے مستقبل کا خیال ہے۔ میرے بھی بچے ہیں۔ میں بھی

اُن سے پیار کرتا ہوں، اگرچہ وہ مجھ سے پیار نہیں کرتے۔ مجھے بھی اُن کے مستقبل کی فکر رہتی ہے۔ پھر بھلا میں آپ کے بچوں سے کیوں نہ پیار کروں گا۔ کیوں نہ اُن کے مستقبل کی فکر کروں گا۔ ہاں، آپ نے کبھی بئے کا گھونسلا دیکھا ہے، بھوپندر صاحب؟"

"بئے کا گھونسلا!" بھوپندر پھر تذبذب میں پڑ گیا۔ سبھی باتیں ٹھیک تھیں، مگر بئے کے گھونسلے نے پھر اسے چکر میں ڈال دیا۔ "کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے گھروں میں عورتیں دہی بلونے کا برتن پٹ سن کی گدی سے صاف کر لیتی ہیں۔"

"تو لیجئے میں آپ کو دکھاتا ہوں۔" اس نے بغل کی الماری کھول کر بئے کا گھونسلا نکالا۔ "میں نے یہ گھونسلا سات سال پہلے ایک درخت سے اتارا تھا۔"

بھوپندر نے گھونسلا اُس کے ہاتھ سے لیا اور دیکھنے لگا۔ اگرچہ اس سے اُسے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

"مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔" وہ کہنے لگا۔

"آپ نہیں سمجھتے۔" اس آدمی نے کہا "بیا ایک آرٹسٹ ہوتا ہے۔ وہ اپنے آرٹ میں حسن اور افادیت بھر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کتنی باریک بافت ہے اس گھونسلے کی! اور پھر وہ اس گھونسلے کو نہایت نرم شاخوں پر بناتا ہے، جو آندھی سے جُھک جاتی ہیں، مگر ٹوٹ نہیں سکتیں۔"

بھوپندر پھر گھونسلے کو ملاحظہ کرنے لگا۔

"آج سے سات برس پہلے۔" اس آدمی نے کمرے کے مختصر خلا میں دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا جیسا اکثر فلموں کے فلیش بیک منظروں میں دکھایا جاتا ہے۔ "آج سے سات برس پہلے جب میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھا، مجھے شطرنج کا بہت شوق تھا۔ دفتر سے لوٹتے وقت راستے میں ایک دوست کے ہاں بیٹھ جاتا اور شطرنج کی بازیاں جو شروع ہوتیں تو رات کے بارہ بج جاتے۔ گھر سے بار بار پیغام آتا مگر ہمیں فرصت ہی کہاں تھی۔ وہ صاحب اپنے لئے کھانا منگواتے تو میں بھی تھوڑا بہت کھا لیتا۔ بازی بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی۔ نیند کا غلبہ ہوتا تو بساط اُٹھا دیتے۔ گھر لوٹتا تو دروازے بند، محلہ سنسان۔ بیوی بولنا بکنا شروع کرتی تو سارے محلے کو جگا دیتی۔ میں بستر میں دبک کر پڑا رہتا۔ اگلے دن پڑوسی مذاق اُڑاتے۔ خیر، ایک دن ہم نے بساط بچھائی ہی تھی کہ میرے دوست کا چھوٹا لڑکا آ گیا اور کہنے لگا 'پتاجی! ہم تو بئے کا گھونسلا لیں گے۔'

"کل بازار سے لا دیں گے۔" انہوں نے فیل کو شہ دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہم بئے کا گھونسلا لیں گے۔" وہ بچہ رونے لگا۔ "باہر درخت پر لگا ہے۔ ہمیں اُتار دو۔"

"میں کہتا ہوں، تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" وہ رنجیدہ ہو کر چلائے۔ "بازار جائیں گے تو لا دیں گے۔"

مگر بچہ برابر رو رہا تھا۔ میں نے کہا "بچے کو گھونسلا اُتار دیتا ہوں، پھر اطمینان سے بازی کھیلیں گے۔"

یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھر کے باہر ایک وسیع صحن تھا جس کے وسط میں نیم کا ایک پیڑ تھا۔ میں نے دیکھا درخت کے بہت اوپر پتوں کے درمیان بئے نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ میں فوراً درخت پر چڑھ گیا اور گھونسلے کو پکڑنے کے لئے جُھکا۔ مگر جس شاخ پر میں کھڑا تھا وہ ٹوٹ گئی۔ اور میں زمین پر آ گرا۔ گھر کے سبھی لوگ بھاگے اور مجھے اٹھا کر اندر لے گئے۔ میں بیہوش تھا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ اُس نے ہسپتال بھیجنے کا مشورہ دیا۔ تین

مہینے ہسپتال میں رہا۔ پھر رکشا میں ڈال کر مجھے گھر لے آئے۔ دونوں ٹانگیں ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو چکی تھیں۔

"دونوں ٹانگیں ؟" بھوپیندر نے ایک لمبی سانس لی۔

"ہاں ہاں !! وہ پھر کہنے لگا۔ "دونوں ٹانگیں ۔"

بھوپیندر نے پھر لمبی سانس لی۔ وہ آدمی کہہ رہا تھا "میرے دوست کبھی کبھی ملنے آجایا کرتے تھے۔ مگر میرے پاس ان کا دل بہلانے کے لئے بیئے کے گھونسلے کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔ مگر ایک ہی کہانی سے زندگی نہیں کٹتی ! اور اب میں اکیلا ہوں ۔"

بہت افسوس ناک بات سنائی آپ نے ۔" بھوپیندر نے اس کے فلسفہ سے قطع نظر کر کے کہا۔

"اگلی بار سناؤں گا تو آپ جمائیاں لینے لگیں گے ۔" اس نے اپنا فلسفہ دہرا دیا۔ "دراصل ہم لوگ زندگی میں ہمیشہ کسی جدت کے متلاشی رہتے ہیں اور جدت تنوع سے پیدا ہوتی ہے۔ تکرار سے نہیں ۔"

لیکن بھوپیندر کو کسی جدت کی تلاش نہ تھی اُسے تو اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر تھی۔ کیونکہ اس کے محلے کا ماحول بہت گندا تھا اس کی بیوی مر چکی تھی اور اس نے مجرمانہ ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کے بارے میں بہت سے مضامین پڑھ لئے تھے۔ اور پھر سپرنٹنڈنٹ نے صرف ایک گھنٹے کی چھٹی دی تھی۔ اُسے ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کئی صدیوں سے سمندر کی تہہ میں مونگے کا محل ڈھونڈ تا رہا تھا۔ پھر ایک درخت سے بیئے کا گھونسلا اتارنے کی کوشش کی مگر نیچے گر پڑا۔ تین ماہ ہسپتال میں رہا۔ پھر سات سال کمرے کی خاموش تاریکی میں اس کے دوست اس کے غم سے بیزار ہو چکے تھے اور انہوں نے اس کے پاس آنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ انہیں اپنا دل بہلانے کے لئے جدت کی ضرورت تھی۔ اور جدت تاریک اور خاموش کمرے میں جنم نہیں لیتی۔ اس کے لئے روشنی اور آواز چاہیئے ۔

"معاش کا کیا ذریعہ ہے ؟" اُس نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری بیوی ایک گرلز اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہے ۔" وہ کہنے لگا "تین سو روپیہ ماہوار ملتا ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولا۔ "آپ بچوں کو کب بھیج رہے ہیں۔ میرے پاس ؟"

"سوموار سے پڑھانا شروع کر دیجئے۔" بھوپیندر نے کہا۔ "اگر وقت ملا تو کل دونوں بچے آپ کے پاس لے آؤں گا۔ آپ کا مکان بھی دیکھ لیں گے اور آپ سے تعارف بھی ہو جائے گا۔"

"اچھی بات ہے ۔" اس نے سرہانے کے نیچے سے ایک ادھ جلا سگریٹ کا ٹکڑا نکالا اور اسے سُلگانے لگا۔ "آپ سگریٹ...."

"نہیں، نہیں شکریہ !" بھوپیندر گھڑی دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے دفتر کے لئے دیر ہو رہی ہے ۔"

"دفتر کا معاملہ ہے تو میں نہیں روکتا ۔" وہ کہنے لگا "کبھی کبھی آجایا کیجئے نا۔ آپ کے آنے سے پہلے میں بہت اداس تھا پانچ بجیں گے تو بچے اور اُن کی ماں سکول سے آجائیں گی۔ پھر یہاں رونق ہو جائے گی۔ لیکن وہ رونق مختلف قسم کی ہے۔ خیر ! آپ کل آئیں گے ؟" اس نے مُسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ضرور آؤں گا ۔" بھوپیندر نے تیسری بار گھڑی کو دیکھا۔

"دیکھئے، اس کھڑکی کو بند کرتے جائیے ۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "اب کل آپ ہی آکر اسے کھولیں گے ۔"

بھوپیندر نے کھڑکی بند کر دی اور نمسکار کر کے باہر نکل گیا۔

دروازے پر کھڑے ہو کر اُس نے مکان کو ایک نظر پھر دیکھا۔ دروازے پر ایک پرانی تختی لٹک رہی تھی۔ بھوپندر چونک پڑا۔ قریباً پندرہ منٹ دروازے کے باہر کھڑا رہا تھا۔ مگر یہ تختی اس نے نہ دیکھی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اس پر لکھا تھا ——

"ایس۔ این۔ ورما"

اتوار کے روز بھوپندر نے بچوں سمیت اپنے دوست کے ہاں کھانا کھایا۔ میٹرو میں پکچر دیکھی اور پھر تینوں باپ بیٹے ورما جی کے ہاں پہنچ گئے۔ اب کی بار اُسے گلی میں کسی کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا تھا۔ ڈرائنگ روم کی تینوں کھڑکیاں بند تھیں۔ عقبی صحن میں شور ہو رہا تھا۔ کوئی عورت بدل بک رہی تھی اور شاید کسی بچے کو پیٹ بھی رہی تھی۔ کیونکہ بچے کے رونے کی آواز گلی میں صاف سنائی دیتی تھی۔ بھوپندر نے ایک بار پکارا "ورما جی!"

اس کی آواز بچے کی چیخ پکار اور عورت کی بک جھک میں کھو کر رہ گئی۔ اس نے پھر پکارا۔ اندر سے آواز آئی "چلے آیئے!" اور اس کے ساتھ ہی پچھلے صحن سے ایک عورت باہر نکلی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور لبوں کی لپ سٹک باسی ہو رہی تھی۔

"آپ کس کو پکار رہے ہیں؟" عورت نے پوچھا۔

"مجھے ورما جی سے ملنا ہے۔" بھوپندر نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عورت نے ایک بار بھوپندر کو سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر بچوں کو، اور پھر کچھ کہے بغیر تیزی سے اندر چلی گئی۔

بھوپندر بچوں کو لے کر اندر گیا۔ کمرے میں بدستور اندھیرا تھا۔ مگر اب کی بار اُسے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلی دو کھڑکیاں کھول دیں۔

"تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ۔" ورما جی نے رسالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا "بیٹھئے"۔ انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

بھوپندر بیٹھ گیا۔ "آؤ بچو! ادھر آؤ میرے پاس۔ کیا نام ہیں تمہارے؟"

"رمیش کمار" چھوٹے نے آگے بڑھ کر کہا۔

"اور تمہارا؟" ورما جی نے دوسرے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ "بہت شرماتے ہو تم!" انہوں نے بچے کو اپنے بازو میں روک لیا۔ "ہاں، ہاں! بتاؤ نا کیا نام ہے تمہارا؟"

"پریش کمار" اس نے جواب دیا۔

"اوہ، تم تو بہت اچھے لڑکے ہو" ورما جی نے کہا۔ "اچھا دیکھو پریش، تم کون سی جماعت میں پڑھتے ہو؟"

"دونوں پانچویں جماعت میں پڑھ رہے ہیں۔" بھوپندر نے قصہ مختصر کیا۔

مگر اسی اثنا میں عقبی صحن میں پھر شور اُٹھا۔ اسی عورت کی بک جھک اور بچے کے رونے کی آواز۔

"بہت کام کرنا پڑتا ہے بے چاری کو!" ورما جی اپنی بیوی کے بارے میں کہہ رہے تھے "سارا دن سکول میں تعلیمی اور انتظامی سلسلے میں کام کرنا پڑتا ہے۔ پھر گھر میں کھانا بنانا، سینا پرونا۔ بچوں کی دیکھ بھال، صفائی وغیرہ۔ ستم تو یہ ہے کہ بچے بہت تنگ کرتے ہیں۔ کبھی لڑائی جھگڑا۔ کبھی ضد۔ کبھی ایک چیز توڑ دی، کبھی دوسری کھو دی۔"

"لیکن بچوں کو اس بے دردی سے پیٹنا بھی تو ٹھیک نہیں!" بھوپندر سے رہا نہ گیا۔ "اس سے بچے ضدی ہو جاتے ہیں۔ اور والدین کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کر لیتے ہیں۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" ورما جی کہنے لگے۔ "لیکن دیکھیے نا، اگر گھر کے سبھی دھندے ایک ہی آدمی کو کرنا پڑیں تو اس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جانا قدرتی ہے۔"

اتنے میں شرمتی ورما ایک بچے کو کان سے پکڑے ڈیوڑھی میں آ گئیں اور بولیں۔ "آپ نے دیکھا، پرسوں چائے دانی توڑ دی تھی۔ اب میکانو کے لئے ضد کر رہا ہے۔ ان بچوں نے تو شاید یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ میرے پاس روپے گھڑنے کی کوئی مشین ہے۔ کہتا ہے، اگر میکانو نہ ملا تو کل سکول نہ جاؤں گا۔"

"شانت! شانت!!" ورما جی نے کہا۔

"تم تو ہمیشہ مجھے شانتی کا پاٹھ ہی پڑھاؤ گے!" وہ تنک کر بولیں۔ "تمہیں اس سے کیا کوئی مرے یا جئے۔ تم اپنے مندر سے باہر نہ نکلو گے!"

"مجھے اس مندر میں بیٹھ کر خوشی تو نہیں مل رہی!" ورما جی نے جواب دیا۔

"اندر دکھ بھی کا ہے کا ہے؟" شرمتی ورما نے چلا کر کہا۔ "بیٹھے بٹھائے روٹی، کپڑا، سگریٹ، رسالے، چائے سبھی کچھ تو مل رہا ہے۔ اور کیا چاہئے تمہیں؟"

اور اتنا کہنے کے بعد وہ بچے کو پھر بے تحاشا پیٹنے لگیں۔ ایک بار تو بچے کا سر دیوار کے ساتھ اتنے زور سے ٹکرایا کہ بھوپندر کو ایسے لگا، جیسے اب وہ جانبر نہ ہو سکے گا۔ اس کے دل میں بار بار اس جھگڑے میں مداخلت کرنے کی تحریک ہوتی۔ مگر کسی کے گھریلو معاملہ میں ٹانگ اڑانے کی اس میں ہمت ہی کہاں تھی، مبادا وہ عورت اسے بھی کٹی سنانا شروع کر دے اور شرما جی کے ساتھ اسے بھی نکو بننا پڑے۔

شرمتی ورما جب بچے کو مارتے مارتے تھک گئیں۔ تو اسے چھوڑ کر تیزی سے اندر چلی گئیں۔ بچہ کچھ دیر تو فرش پر پڑا بلبلاتا رہا۔ پھر وہ بھی اٹھ کر صحن میں چلا گیا۔

"وہ سناتن کنیا ہائی سکول میں ہیڈ مسٹرس ہیں۔" ورما جی نے اپنی بیوی کا مزید تعارف کرایا۔ "تیس استانیاں ان کے ماتحت کام کر رہی ہیں۔ پھر ایک چپڑاسی ایک مالی، اور چوکیدار بھی ہے۔" شاید وہ اپنی بیوی کی سماجی اہمیت واضح کر کے بھوپندر کے دل سے باقی سبھی خیال نکال دینا چاہتے تھے۔

مگر بھوپندر کو اس تعارف سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ذہنی طور پر اس گفتگو سے بہت دور تھا، مگر مروت کی خاطر ورما جی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے تو اپنے بچوں سے دلچسپی تھی۔ ان کے مستقبل کی فکر تھی۔ کیونکہ ان کی ماں مر چکی تھی۔ اور گلی کے باقی سب بچے آوارہ تھے۔

عقبی صحن میں شرمتی ورما اب کی بار شاید کسی اور بچے پر ہاتھ صاف کر رہی تھیں۔ بچہ بہت اونچی آواز میں چلا رہا تھا۔ اپنے بچے کا احساس کر ورما جی کو دیش کے بچوں کا خیال ترک کرنا ہی پڑا۔ وہ خاموش ہو گئے، جیسے کسی مصیبت کے منتظر ہوں۔

بھوپندر نے پریشانی کے عالم میں اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔ پھر ورما جی کی طرف، اور پھر دیوار میں لگے کلاک کی طرف، جس کی ٹک ٹک بچہ کی چیخ پکار میں کھو چکی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی بیٹھیے بھی!" ورما جی کہنے لگے۔ "آج آپ کو کیا جلدی ہے؟ آپ کے آنے سے . . . . !"

شرمتی ورما بچہ کو کان سے پکڑے پھر ڈیوڑھی میں آ دھمکیں۔ اور ورما جی کو اپنا فقرہ ادھورا ہی چھوڑنا پڑا۔

"کچھ سنا تم نے؟" وہ کڑک کر بولیں۔ "تین دن سے نہیں نہایا۔ اب کہتا ہے، جب تک ربڑ کا تانہیں لے گا۔ نہیں نہاؤں گا۔"

اور یہ کہہ کر انہوں نے بچے کو تابڑ توڑ تھپڑ لگانا شروع کر دیئے۔ بچہ بلبلا رہا تھا۔ اور ورما جی خاموش، اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جب یہ ناٹک ختم ہوا، منوہرا

گھسیٹ کر بچے کو اندر لے گئیں۔ اور وہاں سے روتا چھوڑ کر تیسری بار ڈیوڑھی میں نمودار ہوئیں۔ اور بولیں "تمہیں تو بس چاہئیں اور سگریٹ، چائے، رسالے اور بس! صبح سے چانے دانی کے لئے بک رہی تھی۔ اب پتہ چلا کہ تمہارے لاڈلے نے توڑ کر اینڈھن کی ٹوکری میں پھینک دی تھی۔ تین روپے اس کے لئے چاہئیں۔ گڈی کے سبھی فراک پھٹ گئے ہیں۔ اور وہ کل سے سکول نہ جانے کی دھمکی دے رہی ہے۔ بیس روپے اس کے لئے چاہئیں۔ گوپال کے لئے میکانو چاہیئے۔ ببری کے لئے ربڑ کا کتا۔ اور تمہارے لئے سگریٹ، چائے اور رسالے۔ آخر تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے یہ روپے کہاں سے آتے ہیں۔"

"تم مجھے کیوں پریشان کرتی ہو؟" ورما جی نے جھنجھلا کر کہا۔ "کسی طرح بچوں کو سمجھا بجھا کر چپ کراؤ۔ میرا نہیں تو کسی دوسرے شریف آدمی کا لحاظ تو کر لیا کرو۔"

"اچھا!! تو اب تم مجھے شرافت کا پاٹ پڑھاؤ گے!" شریمتی ورما اپنے خاوند کی بات کو نہ سمجھتے ہوئے پھٹ پڑیں۔ "سارا دن سکول میں بک جھک کرتی ہوں۔ گھر پہ بچوں کے ساتھ دماغ پچی! نہ گھر پہ چین نہ سکول میں آرام! اور ابھی نگوڑی شرافت میرے پاس نہ پھٹکی!"

"لیکن میں تو......" ورما جی کسی نئی دلیل سے آگے بڑھے۔ مگر شریمتی ورما نے دھم سے دروازہ بند کیا۔ اور صحن میں چلی گئیں۔ ورما جی نے ایک لمبی سانس لی۔ اور سرہانے کے نیچے سگریٹ کا ایک ٹکڑا ڈھونڈنے لگے۔

اس غلیظ ماحول میں بھوپندر کا دم الجھ رہا تھا۔ اس کے بچے ہم کراس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ورما جی نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ اور اپنی خفت کو چھپانے کے لئے ایک رسالہ دیکھنے لگے۔ عقبی صحن میں خاموشی تھی۔ یا شاید اس بار شریمتی ورما گڈی پہ ہاتھ صاف کر رہی تھیں۔ کیونکہ اس کے سبھی فراک پھٹ گئے تھے۔ کیونکہ نئے فراکوں کے لئے بیس روپوں کی ضرورت تھی۔ اور گھر میں شریمتی ورما کے علاوہ اور کوئی نہ جانتا تھا۔ کہ یہ روپے کہاں سے آتے ہیں۔ ڈیوڑھی اور صحن کے درمیان کا دروازہ بند ہو جانے سے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اور اس خاموشی میں دیوار پر لگے کلاک کی ٹک ٹک ایک بار پھر فضا میں ابھر آئی۔ بھوپندر کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے دل پر کوئی ہتھوڑے چلا رہا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ جا رہے ہیں؟" ورما جی نے رسالے سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے ٹھہری آواز میں کہا۔ جیسے انہیں ڈر تھا۔ بھوپندر چلا جائے گا۔ یا جیسے وہ چاہتے تھے۔ وہ فوراً وہاں سے چلا جائے۔

بھوپندر نے نمسکار کیا۔

ورما جی کہنے لگے۔ "دیکھئے، میرے پاس آپ کا دل بہلانے کے لئے کوئی سامان نہیں مجھے افسوس ہے، میں آپ کو چائے بھی نہ پوچھ سکا۔ بات دراصل یہ ہے......"

"پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔" بھوپندر نے قطع کلام کیا۔

"آپ کے بچے تو کل آئیں گے نا؟" ورما جی نے مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ضرور آئیں گے ضرور آئیں گے!!" بھوپندر اس سوال پر گھبرا گیا۔ جیسے کسی ارتکابِ جرم کے موقع پر پکڑا گیا ہو۔

"کس وقت انتظار کروں ان کا؟" انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

"دیکھیے نا، سکول سے پانچ بجے لوٹتے ہیں۔" بھوپندر نے اپنی گھبراہٹ سمیٹتے ہوئے کہا۔ جیسے اسے شک تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ "بس یوں سمجھ لیجیئے، ٹھیک چھ بجے آپ کے پاس پہنچ جائیں گے ــــ اچھا نمسکار!" وہ جانے کے لئے مڑا۔

"دیکھیے!" بھوپندر نے ایک مجرم کی طرح پیچھے دیکھا۔ "یہ کھڑکیاں بند کرتے جائیے! اب کل آپ کے بچے ہی انہیں کھولیں گے۔"

ٹھیک چھ بجے شام "

بھوپندر نے فوراً کھڑکیاں بند کردیں اور بچوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ دوباجی کو اندھیرے اور خاموشی میں چھوڑ کر۔

سارا راستہ وہ یہی سوچتا رہا۔ کیا ایسے ماحول میں بچوں کو پڑھنے کے لئے بھیجنا ٹھیک رہے گا؟ ۔ بُرے گھروں میں پرورش پانے والے مجرم بچوں کی روئیدادیں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ وہ بچے جن کے باپ نہیں تھے۔ اور جن کی مائیں اُن کی مناسب نگہداشت نہ کر سکیں۔ وہ بچے جن کے ماں باپ ہمیشہ کتے اور بلی کی طرح لڑا کرتے تھے۔ وہ بچے جو بڑے ہو کر اپنے لئے نہیں، بلکہ سارے سماج کے لئے ایک مستقل لعنت بن گئے تھے۔ اس نے ایک نظر ہیش اور پرکیش کو دیکھا جو نہایت خاموشی سے اس کے پہلو میں چل رہے تھے۔ اور اس کی پشت کی درمیانی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ کیا اُس کے بچے اس ماحول میں رہ کر زندگی کے صالح اثرات لے سکیں گے؟! ...... کیا انہیں بھی کسی ماہر نفسیات کی تحقیقات کا موضوع بننا ہوگا!!

پھر دوباجی کی تصویر نگاہوں کے سامنے ہچکولے لینے لگی۔ ایک مختصر سا کمرہ، ایک چارپائی، دو کرسیاں کچھ رسالے، تین کھڑکیاں، بیئے کا گھونسلا!!

...... میں ہر وقت کسی ایسے شہزادے کا منتظر رہتا ہوں ...... آپ کی بیوی مرگئی؟! چلو، یہ بھی اچھا ہوا ...... مونگے کا محل میکانو، ربڑ کا کتا .... ٹک ٹک! ٹک ٹک!! .... اب کل آپ کے بچے ہی ان کھڑکیوں کو کھولیں گے .... انہیں تعلیم ملے گی مجھے روشنی اور آواز ...... ٹک ٹک! ٹک ٹک!! ...... ٹک ٹک! ٹک ٹک!! ....

اور بھوپندر کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ دھرتی کی اندھی اور گونگی کوکھ میں دھنس رہا تھا۔ اور روشنی اور آواز کے لئے چلا رہا تھا ....

○

غم عالم فراواں است و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگِ بیاباں را

(اورنگ زیب عالمگیر)

افضال ثانی

ایک حادثہ

ہر روز ایک بجے کے قریب وہ اسے "مب" روڈ پر سے گذرتے ہوئے دیکھتا۔ حتیٰ کہ وہ اسے دوسری خواتین سے قدرے مختلف نظر آنے لگی۔

دائیں ہاتھ میں سرخ رنگ کا لانگ کوٹ۔ بائیں ہاتھ میں دو تین کاپیاں اور ایک یا دو کتابیں ــــ عنابی رنگ کا لمبی آستین کا سویٹر ــــ برقع کے نقاب سے آدھا ڈھانپا ہوا چہرہ یوں معلوم ہوتا جیسے نصف چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا ہو۔ قوس قزح کی طرح آسمان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی مانگ ــــ دور کسی نامعلوم جگہ پر بیٹھا کوئی شخص اس کے لئے ان اجزا میں حسن آمیزی کر رہا تھا۔

متعدد بار اسے بغور دیکھنے سے اس کی حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اگر دور سے بھی وہ کسی عورت کو اس کے مشابہ پاتا تو بے چینی کی حالت میں بھی فیصلہ کر لیتا کہ بس "وہی" ہے۔

وہ خاصی جاذبِ نظر تھی ــــ بڑی بڑی بے چین سی نگاہیں۔ شاعر کے اس خیال کی طرح جو ذہن کی عمیق وادیوں سے نکل کر چند حسین الفاظ کی مالا پہننا چاہتا ہو ــــ اور اس کا جی چاہتا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں غوطہ لگا کر اضطراب اور بے چینی کے اس طوفان میں غرق ہو جائے جس میں وہ، کنڑا سے گھری ہوئی نظر آتی۔ اس کا جی چاہتا کہ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرے یا وہی کوئی سیب ہاتھ میں لئے اس کے پاس چلی آئے۔ لیکن کئی ایک رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل تھیں ــــ

آخرکار ایک روز ہمت کر کے وہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ــــ

ذہن میں تعاقب کا خیال آنے کے ساتھ ہی اس پر جیسے بجلی کوند گئی ــــ حلق خشک ہو گیا۔ اور ٹانگوں نے بے تحاشا لرزنا شروع کر دیا ــــ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ــــ سارا جسم ایک ہلکی سی اعصابی جنگ کا شکار ہو گیا ــــ اس پر بھی اس نے ہمت نہ ہاری ــــ پورا بازار کرنے کے بعد وہ "مٹ" روڈ پر ہو گئی ــــ اور وہ بھی ــــ ایک بار قریب سے گذر کر جلدی میں ایک جملہ انگریزی میں کہا۔ لیکن کوئی فوری ردِعمل نہ ہوا۔ گھبراہٹ دامن گیر تھی، اور وہ پریشان ہو رہا تھا۔ اس خوف کے مارے کہ اس کی ہلکی سی ایک چیخ بھی کھڑے ہوئے ذہنوں اور بے لگام زبانوں کا ایک مجمع اکٹھا کر سکتی تھی ــــ اور ایسے موقع پر سپاہی کا آنا بھی یقینی امر تھا ــــ چنانچہ تیز تیز ڈگ بھرتا۔ وہ چند قدم اس سے آگے نکل گیا ــــ اس نے اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ فروٹ والے سے مالٹے خرید رہی تھی ــــ

لفٹ مل رہی ہے ــــ اس نے سوچا لیکن اس کی اپنی جیب تو مالٹے کے چھلکے سے بھی زیادہ ہلکی تھی ــــ وہ اس وقت کی بے بسی پر تلملا اٹھا۔ ادھر ادھر نیچے دیکھا۔ شاید کہیں کسی کا گرا ہوا دس کا نوٹ ہی مل جائے ــــ مگر ایسا کہاں ہوتا ہے ــــ اس نے سوچا ــــ

کاغذ کے لفافے کی چرچراہٹ سن کر اس نے قیافہ لگایا کہ وہ چل رہی ہے۔ ایسا سنہری موقعہ ہاتھ سے کھو دینے کے بعد بھی وہ چلا جا رہا تھا ــــ کدھر؟ یہ سوچنے کی اس کے ذہن کو فرصت ہی کب تھی ــــ

کچھ راستہ طے کرنے کے بعد اس نے جب دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو آس پاس کسی گلی میں غائب ہو چکی تھی۔

بادلِ نخواستہ وہ اپنے دفتر لوٹا۔ کیونکہ کھانے کا وقفہ ختم ہو چکا تھا۔۔۔۔ دفتر آن کر اس کا جی فائلوں میں بالکل نہ لگا۔ ۔۔۔ "یہی جی چاہتا ہے کہ یہ بے جان کاغذ نوٹوں میں تبدیل ہو جائیں! پھر کیا ہو؟۔۔۔۔ ان میں زندگی کی لہر دوڑ جائے گی۔۔۔۔ صرف یہی نہیں، طوفان بپا ہو جائیں گے۔۔۔۔ ایک چھوڑ کئی زندگیاں خریدی جا سکتی ہیں۔ اتنے سارے روپوں سے تو!"۔۔۔۔ فائلیں تو خیر اپنی جگہ پر ہی رہیں۔ البتہ اس کے ذہن کی عجیب حالت ہو گئی تھی جو کسی قیمت پر بھی اس واقعے کو فراموش کرنے پر آمادہ نہ تھا۔۔۔۔ عجیب الجھن ستا رہی تھی۔ اسے "کل پھر وہ پھل خریدے گی؟"

"ہاں ضرور خریدے گی!"

"شاید کل سے وہ اس راستے سے گذرنا بند کر دے۔ اور پھر میں اس کی شکل دیکھنے کو بھی ترس جاؤں!"

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا!"

"پھر کیا ہوگا؟"

اس قسم کے مبہم سوالات کا سلسلہ اس کے ذہن میں چل نکلا تھا حتیٰ کہ چھٹی کا وقت قریب آگیا۔۔۔۔ وہ فوراً ہیڈ کلرک کے پاس گیا۔۔۔۔ اور اُن سے کہلوا کر خزانچی صاحب سے دس روپے قرض لے لئے۔۔۔۔ اور اس نے سوچا یہی کافی ہے۔ جتنی بڑی رقم مانگتا اتنی زیادہ منت سماجت کرنا پڑتی۔۔۔۔ دس روپے مل گئے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے صف آرا فوج کو میدانِ جنگ میں اچانک بہت بڑی کمک آن پہنچے۔ اور پھر فتح یقینی ہو جائے۔

رات بھی دن کی طرح بے چینی میں کٹی۔۔۔۔ آدھی رات کے بعد دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی۔۔۔۔ وہ سمجھا دیر ہو گئی اور دن نکل آیا ہے۔ لیکن بتی جلا ٹائم پیس دیکھا تو دو بج رہے تھے۔۔۔۔ اپنی اس احمقانہ سی حرکت پر وہ خود ہی ہنس دیا۔

اگلے روز دفتر پہنچ کر وہ "ایک بجنے" کا انتہائی بے تابی کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔۔۔۔ اُسے یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وقت الٹے پاؤں بھاگ رہا ہے۔ اور گھڑی سے "ایک" کا گھنٹہ غائب ہو گیا ہے۔۔۔۔ خدا خدا کر کے ایک بجا اور آن کی آن میں وہ اُس جگہ آن پہنچا۔ جہاں اس کی کھوئی ہوئی نظریں اپنا مرکز ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور اسی روز اسے احساس ہوا تھا کہ انتظار کی گھڑیاں واقعی کٹھن ہوتی ہیں۔ بار بار گھڑی کو دیکھا۔ ہر برقعہ پوش عورت کو جو اُسی جانب سے آ رہی تھی۔ گھور گھور کر دیکھا۔ لیکن وہ نہ آئی اور وہ مایوس ہو گیا۔۔۔۔ دس کے نوٹ کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔۔۔۔ ایک بار اس نے سوچا کہ ان روپوں سے تاش کھیل کر دس کے بیس بنائے جائیں۔۔۔۔ اور پھر بیس کے بیسیوں بن سکتے ہیں! لیکن وہ جانتا تھا کہ قسمت اس کا ساتھ نہ دے گی۔۔۔۔ اگر ساتھ دیا ہوتا تو وہ آنہ جاتی؟۔۔۔۔ آخر کار وہ نوٹ اس نے جیب میں رہنے دیا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔

اسے یقین تھا کہ وہ اگلے روز بھی اسے نظر نہ آئے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔۔۔۔ دراصل، یہی چھوٹے چھوٹے حادثات ہی تو "زندگی" نام کی چیز کی تشکیل کرتے ہیں۔۔۔۔ اس دن وہ "ب" "روڈ" پر خاصی دور چلا گیا۔ اور اب اُسے "م" "روڈ" بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دور ہی سے اُسے دیکھ لیا۔۔۔۔ وہی کوٹ۔۔۔۔ وہی سویٹر، وہی برقعہ۔۔۔۔ اور وہی چال۔۔۔۔ یہ وہی ہے۔ اس نے سوچا۔ سڑک پر غیر معمولی بھیڑ تھی۔۔۔۔ آسانی سے بات کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ اور وہ بھاری بھاری قدموں سے اس کے پیچھے چلتا رہا۔۔۔۔ دیکھ تو وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ گذشتہ چند دنوں سے اور اب تو اس نے جان لیا تھا کہ وہ اس کے قدموں کے نقوش تلاش کرتا چلا آ رہا ہے۔۔۔۔ اب بڑی "م" "روڈ" قریب آ رہی تھی۔۔۔۔ اور ابھی تک کوئی خاص بات نہ ہوتی تھی۔۔۔۔ اسے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔۔۔۔ حوصلا اور ہمت کو یکجا کر کے وہ اس سے ذرا آگے بڑھ گیا اور قریب سے

گذرتے ہوئے کہا ـــــ "ش" ریستوران پلیز" ـــــ "ش" ریستوران کے قریب پہنچ کر دوبارہ اُس نے ہاتھ کے ہلکے لیکن کسی قدر واضح اشارے سے اُسے ساتھ آنے کے لئے کہا ـــــ جونہی وہ بائیں ہاتھ کو مڑی۔ وہ حیران رہ گیا ـــــ چار سیڑھیاں چڑھ کر وہ ریستوران میں گھس گیا۔ اور سیاہ برقعے نے بھی اُس کی تقلید کی ـــــ سرخ نرم قالین سے آراستہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی حصہ میں آگیا۔ اور وہ لڑکی بھی ہال کے ایک کونے میں دونوں جا بیٹھے ـــــ ریستوران کی فضا گرم اور پرسکون تھی۔ "چائے پئیں گی آپ یا کافی؟" ـــــ اس نے گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ـــــ سفید لباس والا بیرا میز کے قریب جھکا ہوا تھا۔ اور اس نے کوئی جواب نہ دیا ـــــ بہرکیف اس نے چائے اور سینڈوچیز کا آرڈر دے دیا۔ اور خود کسی مناسب موضوع کی تلاش شروع کر دی۔

"آج بہت سردی ہے؟"

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"کس ایئر میں پڑھتی ہیں آپ؟"

یکے بعد دیگرے اُس نے تین سوال کر ڈالے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ اور وہ بدحواس! "آپ نے بُرا تو نہیں مانا میری حرکتوں کو در اصل ...."

اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ کیونکہ بیرا چائے کے برتن میز پر لگا رہا تھا ـــــ اس نے ڈرتے ڈرتے چائے بنائی اور ایک پیالی اسے بھی پیش کی۔ اور ساتھ ہی سینڈوچ والی پلیٹ ـــــ وہ منتظر تھا کہ "شکریہ" کا لفظ جب اُس کے منہ سے نکلے گا۔ تو کیسا ہوگا۔ وہ مر جائے گا۔ یا دوبارہ زندگی ملے گی اُسے ـــ لیکن وہ حسبِ سابق خاموش بیٹھی سینڈوچ کھاتی رہی ـــــ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی ـــــ چائے کی چند چسکیاں لینے کے بعد اس نے ذرا حرکت کی۔ اور اپنی گود میں پڑی ہوئی کاپی کھول کر کچھ لکھنا شروع کر دیا ـــــ قریب تھا پریشانی اور بدحواسی کے سبب اس کا دماغ پھٹ جائے کہ اس نے وہ کاپی اس کی طرف بڑھا دی ـــــ تحریر پڑھ کر وہ ششدر رہ گیا ـــــ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ریستوران کی چھت اس کے سر پر آن گری ہو ـــــ چائے کی پیالی میں ایک بحری بیڑا غرق ہو گیا ہو ـــــ ناپختہ سے طرزِ تحریر میں اس نے لکھا تھا۔

"میں گونگی اور بہری ہوں۔ اور ڈیف اینڈ ڈم سکول میں پڑھتی ہوں ـــــ میرا نام گیتی آرا ہے"۔

اُسے یوں لگا جیسے وہ بھی گونگا اور بہرا ہو گیا ہو ـــــ جیسے کسی نے اسے ایک اجنبی دیس میں دھکیل دیا ہو ـــــ جلدی ہی اس نے چائے ختم کی ـــــ حیرت، رحم اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات اس کے دل میں ابھر رہے تھے ـــــ اس لڑکی سے گفتگو کرنے سے وہ بالکل قاصر تھا۔ جو بڑی بے چین نگاہوں سے اسے تکے جا رہی تھی۔

بیرا بل لے آیا ـــ ٹپ سمیت ساڑھے چار روپے ادا کرنے کے بعد ساڑھے پانچ روپے اس کے پاس بچ گئے تھے ـــــ جانے کس جذبے کے تحت پانچ روپے اُس نے اُس کی کاپی میں رکھ دیئے۔ اور چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا ـــ باہر کی ہر شے معمول پر تھی ـــ آسمان نیلا تھا۔ اور سفید دھوپ ـــ ریستوران سے باہر آکر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ اس کے قریب آئی اور اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا ـــ "تھینک یو مسٹر ـــ" اور انتہائی پھرتی کے ساتھ ہجوم میں جا ملی ـــــ اور ایک تیز دھار استرے کی طرح اس کے جسم کو کاٹتے ہوئے یہ الفاظ فضا میں تحلیل ہو گئے۔

رشید امجد

وہ کچھ اداس اداس تھا۔

اسے اپنا گاؤں پریم گڑھ یاد آ رہا تھا۔ پریم گڑھ جہاں چاروں طرف فطرت کی دلکشی اور حسن بکھرا پڑا تھا۔ دور دور تک بھاگتی ہوئی پگڈنڈیاں اور ان کے درمیان پھیلی ہوئی چراگاہیں۔ جنگلی پھولوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور نیلے، برف پوش گھاٹیاں اور ان پر تیرتے ہوئے بادلوں کے آوارہ ٹکڑے گویا زندگی کا تمام حسن پریم گڑھ میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ رنگ برنگ پھول آکاش کے ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ گنگناتے جھرنے اور خاموش سوئی ہوئی جھیلوں کے کنارے صنوبر کے بے شمار درخت فطرت کی تمام تر رعنائیوں کو اجاگر کرتے تھے۔ ڈھلوانوں کی طرف دوڑتی شور مچاتی ندیاں۔ فضا میں گڈریوں کے راگ اور دہقان زادیوں کے مدھر گیت چاروں طرف جیسے مشک و عنبر کی سی خوشبو پھیلی ہوئی۔ پریم گڑھ میں فطرت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔

اور "ٹریلے" جہاں اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ جن کی اینٹوں کے تاؤ سے انسانی احساسات کے پھول جھلس کر رہ جاتے ہیں۔ چمنیوں کا کثیف اور بدبودار دھواں تھا۔ جو انسانی ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ موٹی موٹی شیشے کی چار دیواریاں تھیں۔ جن کے اندر دلوں کے آئینوں اور جوانی کے پھولوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ لوہے کی زنجیروں کی طرح بکھری ہوئی سڑکیں تھیں۔ جو انسانوں کو کشاں کشاں زمانے کے تقاضوں کی طرف گھسیٹے لئے جا رہی تھیں۔ یہاں بھلا احساس کے نور اور روح کی پاکیزگی کا کیا کام۔ یہاں تو ہر چیز ضرورتوں کے ترازو پر تولی جاتی تھی!

زرد زرد چہرے۔ گھٹی گھٹی زندگی، کھوکھلے قہقہے، دبی دبی ہچکیاں، شہروں کی زندگی کے دامن میں یہی کچھ تو ہوتا ہے۔

اور بہاری لال آنند کو ان چیزوں سے گویا ازلی بیر تھا۔ اس نے تو زندگی کو اصلی روپ میں دیکھا۔ وہ روپ جو زندگی کو فطرت نے عطا کیا ہے جس میں تن کی ضرورتوں کی بجائے حسن کی ضرورتوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور پھر ظلم یہ کہ جہاں وہ آ کر ٹھہرا تھا۔ وہ جگہ تو اس کے لئے خاص طور پر تکلیف دہ تھی ایک بدنما انوکھا سا عجیب و غریب اور طلسماتی قسم کا محل جس کی ہیئت دیکھ کر صدیوں پرانی جناتی باتیں ذہن کو گھیر لیتی تھیں۔ زمانے کے بوجھ سے ایک طرف کو جھکا ہوا۔ بے شمار کمرے تنگ و تاریک لمبی لمبی راہداریاں، پُر پیچ اور عجیب راستے۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ خدا کی دنیا کو چھوڑ کر کسی دیو کے زندان خانے میں آ پہنچا ہے۔ ایک کمرے میں اگر چوہا کودے تو سارے مکان میں گویا ہلچل مچ جاتی۔ کہیں سے مٹی گرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے سارے محل کی چھت ابھی گر پڑے گی۔ اس کے تو دن رات اسی ادھیڑ بن میں گزرتے کہ زندگی جیسی ضعیف چیز کو اس ہیبت ناک مکان میں بھلا کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ بڑی بڑی چھپکلیاں چھوٹے چھوٹے کیڑوں پر جھپٹتی رہتیں۔ دوڑتے ہوئے چوہے اور ان کا تعاقب کرتی ہوئی خوفناک کالے بالوں والی بلی۔

وہ ڈر سا جاتا۔

وہ کبھی کبھی سوچتا کہ امتا جیسی خوبصورت اور نازک مزاج لڑکی نے اس مکان میں بھلا زندگی کے اٹھارہ سال کیسے گزار لئے۔ بوڑھے رائے صاحب اداس کی جتنی تو خیر آج مرے کل دوسرا دن والی بات تھی۔ انہیں مکان کی خوبصورتی سے کیا غرض۔ یہی کیا کم تھا کہ اتنا لمبا چوڑا مکان ان کو ورثے میں مل

گیا تھا۔ اور پھر بوڑھے رائے صاحب کو تو شاید قدرت نے ان کے جسمانی ڈیل ڈول اور ذہنی زاویوں کی مناسبت سے اس ہیبت ناک مکان میں لا پھینکا تھا بھاری بھرکم جسم، لمبے لمبے غیر مناسب اعضاء، موٹی موٹی ڈراؤنی آنکھیں اور بیسیوں گز کی پگڑی۔ یہ سب کچھ گویا وہ آثارِ قدیمہ کی کوئی یادگار تھا۔

اور پھر مزاج بھی ایسا کہ ان کے ساتھ بات کرنے کے لئے صدیوں پیچھے لوٹنا پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ کوئی ان سے ملنے آتا، اور نہ ہی کسی کو ایسی ضرورت ہی محسوس ہوتی۔ اس بات کا احساس انہیں خود بھی تھا۔ مگر وہ اپنی ہٹ کے بڑے پکے تھے۔ ضد اور بدمزاجی گویا ان کو ورثے میں ملی تھی۔ کسی صحیح بات کو غلط رنگ دینے کے لئے انہیں زیادہ دیر سوچنا نہیں پڑتا تھا۔ جو بات کہہ دی پتھر پر لکیر ہو گئی۔ کسی کی کیا مجال کہ اس سے اختلاف کر جائے۔ یا اسے بدل ڈالے۔

وہ کبھی کبھی محسوس کرتا کہ وہ اور اپنا کبوتروں کا ایک جوڑا ہیں۔ جو بدقسمتی سے گدھوں کے گھونسلے میں آن پھنسے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر اس مکان میں اپنا نہ ہوتی تو وہ کبھی کا یہاں سے بھاگ چکا ہوتا چاہے۔ اسے عمر کر ہی کیوں نہ مرنا پڑتا۔ بوڑھے رائے صاحب اور ان کی پتنی سے تو اسے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ وہ اپنا کے ماں اور باپ تھے۔ ورنہ وہ بوڑھے رائے صاحب اور ان کی پتنی کو اپنے پھوپھا پھوپھی ہونے کی حیثیت سے کوئی ایسی اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ کہ وہ اس پر راج کرنا شروع کر دیں وہ تو محض اپنی مرحوم ماں کی وصیت کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔ اور پھر اپنا کا پیار اس کے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ بس ان کے یہاں رہنے کی بڑی وجہ یہی تھی۔

شاید آنند سے ملنے سے پہلے اپنا بھی اس فضا سے گھبراتی ہو۔ لیکن آنند سے ملنے کے بعد اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے وہ نابیگ کی پرانی حویلی میں نہیں بلکہ پریم گڑھ میں رہتی ہے۔

آنند اور اپنا کے پیار کی روشنی نے ان کے ذہنوں سے ماحول کی تاریکیوں کا احساس ختم کر دیا تھا۔ اگرچہ بوڑھے رائے صاحب کو آنند اور اپنا کا میل ملاپ پسند نہیں تھا۔ لیکن اس مکان کی ہیئت کی وجہ سے وہ ان کی کسی ملاقات میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ سب لوگوں کے کمرے الگ الگ تھے اس وجہ سے بھی آنند اور اپنا کے راستے میں کوئی مشکل حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ دونوں بوڑھے رائے صاحب اور ان کی بیوی کو سوتا چھوڑ کر حویلی کی چھت پر چلے جاتے اور چاند کی اجلی اجلی روشنی میں پہروں بیٹھے ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کرتے رہتے۔ حویلی کی چھت کے سامنے بہتی ہوئی ندی کا نظارہ سرد جسموں میں بھی حرارت پیدا کر دیتا۔ ایک روز چھت پر کھڑے کھڑے آنند نے اپنا سے پوچھا۔

"اپنا اس ندی کا کیا نام ہے۔"

"اس کا کوئی نام نہیں آنند بس یہ ایک ندی ہے۔"

"یہ کہاں سے آتی ہے۔"

"کیا جغرافیہ پوچھ رہے ہو آنند۔"

"پھر بھی مجھے اس سے دلچسپی ہے۔"

"رائے صاحب کے قول کے مطابق یہ ندی دو چھوٹے چھوٹے نالوں سے مل کر بنتی ہے جو پریم گڑھ کی وادیوں کے چشموں سے نکلتے ہیں۔"

"یہ کہاں جاتی ہے۔"

اپنا نے آنند کی طرف دیکھا جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"آنند یہ سب کچھ تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"بس یونہی"

"مگر کیوں ؟"

"وہ بتاؤ نا"

"یہ ندی آگے چل کر ایک بہت بڑے دریا سے ملنے پر مجبور ہو جاتی ہے"

انیتا نے پلٹ کر آنند کی طرف دیکھا۔ اس کی پلکوں پر دو موٹے موٹے آنسو موتیوں کی طرح بوجھ بنے ہوئے تھے۔

"کیوں آنند کیا بات ہے"

"کچھ نہیں انیتا سوچتا ہوں بڑی چیزوں کو چھوٹی چیزیں بُری کیوں لگتی ہیں ؟"

پھر وہ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ اور اس وقت چونکے جب رائے صاحب کی گرجدار آواز نے ان کے کانوں میں زہر انڈیل دیا۔

چند گھنٹے بعد ہی آنند کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا۔ وہ کہاں جائے گا۔ کیا کرے گا۔ یہ باتیں اس کی سوچ سے بالاتر تھیں۔ بس وہ تو یہی جانتا تھا کہ اس کی زندگی چھین لی گئی ہے۔ اور اسے بغیر زندگی کے زندہ رہنا پڑے گا۔

سٹیشن پر اسے یوں ہی کسی مانوس آواز نے چونکا دیا۔

"آنند ٹھہرو"

"انیتا تم"

"ہاں آنند ہم دونوں ساتھ چلیں گے"

"مگر . . . ."

"مگر وگر کچھ نہیں"

"رائے صاحب"

"ان کا ذکر نہ کرو۔ بھلا جہنم میں بھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے۔ جلدی چلو کوئی آ جائے گا"

اور پھر وہ کسی انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ دونوں تیجور پورمیں تین سال رہے۔ ان تین برسوں میں پہلا سال ان کے لئے انتہائی کٹھن تھا۔ اس کے بعد جیسے جیسے ان کی واقفیت بڑھتی گئی لوگوں سے تعلقات بڑھتے گئے۔ ان کی دشواریاں بھی دور ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ بڑے آرام و سکون سے زندگی بسر کرنے لگے۔ انہوں نے شادی بھی کر لی تھی۔

آنند ایک قہوہ ہی میں ملازم ہو گیا۔ اور انیتا گھر کی مالکن بن گئی۔ وہ اس کے لئے پہروں چولہے کے آگے بیٹھتی۔ اور آنند اس کے لئے گھنٹوں کارخانے کی بھٹی کے سامنے جلتا رہتا۔ پیار دنیا کے ہر جہنم کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ وہ جو ایک دوسرے کے لئے تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ انہیں ان کا احساس بھی نہ تھا۔ وہ دونوں تو پگھل کر ایک دوسرے کی روح میں سما گئے تھے۔ اور اس مقام تک پہنچ گئے تھے۔ جہاں انسان اپنے وجود کو محسوس بھی نہیں کر سکتا

انیتا کبھی کبھی اچانک اداس ہو جاتی۔ جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ جاتی ہو۔ آنند کے کئی بار پوچھنے پر بھی اس کی وجہ نہ بتا سکی۔ آخر آنند نے خود ہی تجویز پیش کی کہ کچھ دن کے لئے تاریگ چلتے ہیں۔ رائے صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ اور انہیں اپنے کئے کی سزا بھی کافی مل

چکی ہو گی۔ اپنا منہ سے تو کچھ نہ بولی۔ مگر وہ دل ہی دل میں خوش تھی۔ ماں باپ کو بھول جانا کونسی آسان بات ہے۔ اپنا انہی کے گوشت کا ایک حصہ تھی۔ بھلا ان سے جدا کیسے رہ سکتی تھی۔

وہ پرانی حویلی میں پہنچ گئے۔

"اپنا تم یہیں ٹھہرو!" آنند کا خیال تھا کہ اگر رائے صاحب کا رویہ پہلے جیسے ہوا تو وہ ٹوٹ جائیں گے۔ اسی لئے اس نے اپنا کو دروازے کے باہر کھڑا رہنے کی تاکید کر دی۔

وہ اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں بوڑھے رائے صاحب اپنی پرانی کرسی پر یوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جیسے بھگوان نہ کرے اس دنیا سے سدھار گئے ہوں۔

"آنند نے ان کے جسم کو چھوا۔"

"کون"

وہ گھبرا گیا۔

رائے صاحب آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھے تھے۔

"میں آنند ہوں رائے صاحب"

"آنند"

رائے صاحب کی گرجدار آواز حویلی میں گونجی۔

"ہاں رائے صاحب! میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں شرمندہ ہوں، میں نے واقعی آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ آپ کی آنکھوں کا نور چھینا۔ مگر ۔ ۔ ۔ رائے صاحب اپنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ ابھی فقرہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ رائے صاحب کی گرجدار آواز پھر حویلی میں گونجی۔

"آنند جس دن سے تم نے ہمیں چھوڑا۔ وہ چارپائی سے نہیں اٹھی۔ وہ نہ بولتی ہے اور نہ کچھ کھاتی ہے خالی خالی نگاہوں سے چھت کو گھورتی رہتی ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اپنا کی ماں تو ہم دونوں کو تنہا چھوڑ گئی ہے۔ مگر ہم ابھی تک اس بے نور زندگی کو لئے جی رہے ہیں"

آنند کو ایک لمحہ بھر کے لئے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ سمجھا شاید رائے صاحب آنکھوں کی بینائی کے ساتھ ساتھ ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے ہیں۔ پھر وہ کسی انجانے خیال سے دروازے کی طرف لپکا۔

اپنا غائب تھی۔

وہ اپنا کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اور ٹھٹھک کر رہ گیا۔ ایک اپنا چارپائی پر پڑی تھی اور ایک اس کے سرہانے کھڑی تھی۔

وہ دونوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا

اس کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی۔ چارپائی کے سرہانے سے دھوئیں کا ایک ہیولا سا اٹھا۔ اور کمرے کی فضا میں تحلیل ہو گیا

اپنا چارپائی پر اٹھ بیٹھی تھی

وہ اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا

(مرکزی خیال ایک چینی کہانی سے ماخوذ)

لطیف کاشمیری

کانچ کا پُل

عبدالکریم نے جھولتی ہوئی کھڑکی کے شکستہ پٹ کو ہاتھ لگایا تو وہ کسی بوڑھے کے دُکھتے ہوئے کمزور دانت کی طرح ہلنے لگی۔ اس نے دبی زبان میں مالک مکان کو گالی دیتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔۔۔

" زرینہ کی ماں! دیکھیو۔ یہ دیوس ان سردیوں میں مشکل ہی سے بچے گا۔ میں کہتا ہوں جس مکان کی بنیادیں ہی کمزور ہوں وہ جاڑے کی برف اور طوفان کا کیسے مقابلہ کریگا؟"

بیگماں عبدالکریم کے غصیلے لہجے کو بھانپتے ہوئے دوڑی دوڑی آئی۔ اُسے معلوم تھا کہ جب بھی اس کے خاوند پہ خفگی کا دورہ پڑتا ہے تو وہ بات ہمیشہ اس ٹوٹی پھوٹی بلڈنگ سے شروع کرتا ہے۔ اور اس کا سلسلہ گھر کی عزت سے جاملاتا ہے۔ اور پھر وہی رٹ کہ یہ محلہ لوفروں کا محلہ ہے۔ رہنے کے قابل نہیں۔ ہمسائے ملنے کے لائق نہیں ۔۔۔ بیگماں نے جلدی سے کسی کونے کھدرے سے دو ایک کیلیں نکالیں اور عبدالکریم کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ جنہیں وہ پتھر کی مدد سے کھڑکی کے شکستہ پٹ کی بغل میں ٹھونکنے لگا۔ بیگماں نے میاں کی کنپٹیوں کے نیم سپید بالوں اور لرزتی ہوئی گھنی سیاہ مونچھوں کو دیکھتے دیکھتے کہا۔۔۔

" دونوں طرف میخیں گاڑ دیں۔ ہمیں اس کھڑکی کو کھولنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" یہ کہہ کر وہ تو اپنے گھسٹتے ہوئے چھوٹے بچے کو چمکانے کے لئے زمین پہ جھک گئی۔ مگر یہ سُن کر اندر زرینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے اپنا چھریری انگلیوں والا دُبلا ہاتھ چھاتی پر رکھ لیا؛ اور بہن کو سینے سے چپٹا کر جیسے آہ بھرنے لگی۔۔۔

" ہاں صغری یہ آہستہ آہستہ سب کھڑکیاں بند کر دیں گے۔ مکان کو پنجرہ بنا دیں گے۔"

" پنجرے کے پنچھی رے ۔۔۔" صغری ہنستے ہنستے شوخیوں پہ اتر آئی۔ یہ گانا اس لئے اُسے یاد آگیا تھا کہ صبح ہی ریڈیو پر اُس نے سُنا تھا۔

" پنجرے کا پنچھی پنجرے سے باہر کی دُنیا دیکھ تو سکتا ہے۔ مگر اب تو ایسا لگتا ہے کہ باہر دیکھ بھی نہ سکیں گی۔" زرینہ نے پھر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

" باجی قصور تمہارا اپنا ہی ہے۔" صغری ذرا سنجیدگی سے بولی۔

" وہ کیسے؟" زرینہ ٹھٹکی۔

" نہ تم ہر وقت کھڑکی پر سوار رہا کرتیں۔ نہ شہر کے لڑکوں میں تمہاری جوانی کا چرچا ہوتا۔ نہ آغاجی کھڑکیوں کو میخیں لگانے۔" یہ بات کہہ کر جیسے چھوٹی نے بڑی بہن کے منہ پر میخ گاڑ دی ہو۔ زرینہ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئی۔ پھر جیسے پھٹ پڑی۔

" کم بخت! دو تین سال میں تیری جوانی کا وقت بھی آجائے گا۔ پھر دیکھوں گی کیا کیا شگوفے نہیں چھوڑتی ہو۔"

"باجی کچھ بھی ہو — میں تمہاری طرح ہرایرے غیرے کو کبھی منہ نہ لگاؤں گی" صغریٰ ایک عجیب غرور سے آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔

"چپ، بدزبان! میں تو صرف خوبصورتی کی دیوانی ہوں" زرینہ نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں میچ لیں اور کسی خوبصورت چہرے کا تصور کرنے لگی۔

"بس اب اس کی تعبیر مناؤ کہ کسی روز اس کونے والی کھڑکی میں بھی میخیں نہ گڑ جائیں — پھر تو گھر بالکل قبر بن جائے گا" قبر کی بھنک بیگماں کے کانوں میں پڑی تو اس نے یہی جانا کہ لڑکیاں کڑی نگرانی سے تنگ آ کر حسبِ عادت مرنے کی دعائیں مانگ رہی ہوں گی۔

"کیا ہے لڑکیو؟" وہ جیسے چیخی۔ اور زرینہ صغریٰ کو کہنی سے پکڑ کر اندرونی دروازے کے پیچھے سے چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی۔

عبدالکریم نے کھڑکی کی مرمت سے ہٹ کر مونچھوں کی حالت درست کر کے زور سے کھنکارا اور برآمدے کی واحد کھلی کھڑکی سے آدھا دھڑ نکال کر دائیں بائیں جھانکتے ہوئے زور سے تھوک دیا۔ یوں بے دھیانی میں تھوکنے سے تھوک کی نمی اس کی بٹی ہوئی مونچھوں کے کناروں سے چمٹ گئی۔ جسے اس نے رومال کی بجائے ہتھیلی سے صاف کر لیا۔ اسے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ مکان کی نچلی منزل کے سامنے سے گزرنے والی پتھریلی رہگزر آج تنہا اور سنسان ہے۔ اور آج محلے کا کوئی لفنگا اس کے مکان کی کھڑکیوں کی جانب ٹکٹکی باندھے آہنی جنگلے کے سہارے کھڑا نہیں ہے۔ آخر اس کی مردانہ وار مونچھوں، چہرے کے غصہ بھرے آثار چڑھاؤ اور آنکھوں کی غضب ناک سرخ کیفیت نے گھر میں اور باہر اپنا سکہ جما تو دیا ہے۔ اگر یہ چھوکرے اس کے ظاہری رعب داب اور گالی گلوچ سے ڈر نہ جاتے تو کون جانے اسے بندوق کی بچی بغل میں داب، نشانہ درست کرتے ہوئے کتنی بار کھڑکی پر آنا پڑتا اور کتنی بار اس کی لبلبی دبانا پڑتی۔ بیگماں ناک منکاتے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرتی ہوئی اندر چلی گئی اور عبدالکریم پشت پر ہاتھ باندھے، چھاتی پھلائے، برآمدے میں یوں بلا ارادہ ٹہلنے لگا جیسے وہ کوئی مشہورِ زمانہ پہلوان ہو۔ جو کسرت کے بعد اپنے طاقت ور جثے اور بازوؤں کے کس بل کے زعم میں اکھاڑے میں مٹرگشت کر رہا ہو۔ چہل قدمی کرتے وقت عبدالکریم کے چہرے پر سوچنے کے انداز سے ایک گونہ اندرونی بے چینی اور مضمحل سی کیفیت ابھر آئی۔ جب وہ اپنے ذہن پر مزید دباؤ ڈال کر کچھ سوچنے لگا تو گھنی سیاہ بھنوؤں نے سکڑ کر ایک دوسری کے قریب آ کر اس کی پیشانی پر ان گنت سلوٹیں ابھار دیں اور چہرے کی خاکستری جلد پر مخالف سمت سے آنے والی گوشت کی لکیریں ابھری ہوئی مونچھوں کے کناروں کو چھونے لگیں۔ اس کے نتھنے آپ ہی آپ پھڑپھڑانے لگے۔ وہ محلے کے لفنگوں کا دھیان کر کے انہیں دبی زبان میں صلواتیں سنانے لگا۔ جنہوں نے اس کی ناک میں تب سے دم کر رکھا تھا جب سے زرینہ جوان ہوئی تھی۔ اور کبھی کوئی دن گزرا ہو گا جس روز ان لڑکوں کی شرمستیوں اور ہنگاموں نے اس کے ذہن کا سکون اور دل کا اطمینان درہم برہم نہ کیا ہو — سامنے والے چھوٹے سے ٹیلے میدان میں ہونے والا ہر جھگڑا کسی نہ کسی شکل میں اس کی عزت پر کیچڑ اچھال دیتا اور جھگڑے کی وجوہات اور تفصیلات پھرتی پھراتی مختلف زبانوں سے پھسلتی ہوئی اس کے کانوں تک جب پہنچتیں تو اس کا جی چاہتا کہ ترازو کے باٹ اٹھا کر ہمدرد گاہک کے بے سر سر پہ دے مارے یا اسی وقت دکان کو تالا لگا کر چھاتی ٹھونک کر محلے میں اتر جاتے اور آہنی جنگلے پر منہ لٹکائے گھنٹوں کھڑے رہنے والوں، کھیل کود کے بہانے جمع ہو کر سیٹیاں بجانے اور غل غپاڑہ کرنے والے منچلوں کے سارے بل نکال دے۔ وہ کتنے ہی مہینوں سے اس غیرت دلانے والی صورتِ حال کو بڑے صبر و تحمل اور ایک خاموش تماشائی کی آنکھوں سے بھانپ رہا تھا — بہت ہوا تو زرینہ کو چوٹی سے پکڑ کر دو تین لاتیں رسید کر دیں۔ یا بیگماں اور اس کے خاندان کو دو چار غلیظ سی گالیاں سنا کر غصہ اتار لیا

"میں کہتا ہوں — اپنی لاڈلی — اس کمینی کو نکیل ڈال کر رکھو۔ اس کے کرتوتوں نے تو شہر بھر میں بدنام کر دیا ہے۔ بازار سے چھاتی

پھلا کر چلنا ایک طرف۔ میں تو سر اُٹھا کر بھی نہیں چل سکتا۔"

"میں بھی کیا کروں آخر؟" بیگماں جواب میں کہتی۔ "رکھوالی جتنی ایک ماں کر سکتی ہے، کرتی ہوں۔ اب میں اس کے ساتھ سائے کی طرح تو نہیں رہ سکتی ناں۔ بدذات اتنی بے شرم ہے یہ کہ ذرا میں اِدھر اُدھر ہوتی ہوں تو کھٹ سے کھڑکی کے سر پہ۔ یا دروازے کی چوکھٹ میں ——— میں تو خود تنگ آگئی ہوں سچ مچ۔"

"تنگ آگئی ہو، تو پکڑا دو ہاتھ کسی و بگذر کو کم بخت کا۔ یہ روز روز کا ٹنٹا تو ختم ہو ناں۔" بیگماں عبدالکریم کو غصے میں دیکھ کر وہیں پڑ جاتی۔

"میں تو کبھی کے اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کرتی۔ تمہیں اپنے کاروبار کے مندا ہونے کا رونا رو رو کر میری مت مار دیتے ہو۔ بھلا شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی شادیاں کبھی کوٹھیاں اور مال و دولت دیکھ کر ہوتی ہیں ——— اور پھر زرینہ کو دولت مند گھر بیاہنے سے تمہارے کاروبار کو خاک فائدہ پہنچے گا۔"

"مجھے نہ سہی، کم از کم بیٹی تو سُکھ چین سے زندگی کے دن کاٹے گی نیک بخت۔"

"بورئیے پر سونا اور محلوں کے خواب دیکھنا اسی کو تو کہتے ہیں۔"

"اور تم کیا چاہتی ہو کہ چند روپلیاں پانے والے کسی بھوکے ننگے بابو کے پلّے باندھ دوں۔ جو خود بھی فاقہ کشی کرے اور اسے بھی بھوکوں مار دے۔"

بیگماں کی تکرار عبدالکریم کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی کیونکہ اس میں عبدالکریم کو سب کچھ ملتا تھا مگر دوراندیشی نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ بیگماں جوان بیٹی کے چلبلے پن اور نادانی کی باتوں سے تنگ آکر اسے کسی ایرے غیرے کے سر مڑھنا چاہتی ہے۔ جو اسے قطعی ناپسند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دو اڑھائی سال زرینہ شرافت سے بیٹھی رہے تو کوئی نہ کوئی شریف اور اچھی حیثیت کا ضرور مل جائے گا اور وہ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے بعد سُکھ کا سانس لے گا اور بے فکری کی نیند سویا کرے گا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ زرینہ سات پردوں میں چھُپ کر بھی آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی۔

"اس بیچاری کا بھی اتنا قصور کہاں ہے جتنا محلے کے ان آوارہ گردوں کا۔ جنہیں گلی کے چکر لگانے اور جنگلے پر کھڑے رہنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔" بیگماں کی اس بات پر عبدالکریم نے ٹہلتے ٹہلتے رُک کر ایک بار پھر کھڑکی سے جھانک کر گلی کے نکڑ تک دیکھا۔ اسے پھر خیال آیا کہ کل جو مشتعل ہو کر بندوق سیدھی کئے غراتا ہوا وہ کھڑکی پر آیا تھا اور اس نے جنگلے پر کھڑے ایک لفنگے پر فائر کر دیا تھا۔ تو اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ کہ اسے پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے اپنی جان چھڑانا پڑی۔ مگر آج کوئی مائی کا لال ایسا نہیں۔ جو عبدالکریم کی غیرت کو للکارنے دوبارہ میدان میں آئے۔ ——— کل جب وہ دوپہر کو کھانا کھانے گھر آیا تو بیگماں زرینہ پر لعنت پھٹکار بھیج رہی تھی اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے کوس رہی تھی۔ اس وقت بیگماں نے عبدالکریم کو ایک خط دکھاتے ہوئے کہا۔ "آج پھر موئے بڑھئی کے لڑکے نے چق اٹھا کر خط اندر پھینکا ہے۔ یہ خط اُٹھانے کے لئے دوڑی تو یہی تاڑ گئی اور اس کے ہاتھوں سے خط چھین لیا۔ یہ دیکھو تو کیسے ہماری عزت کا جنازہ نکالنے پر تُلی ہوئی ہے مردود۔"

عبدالکریم نے خط اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ پڑھ نہیں سکتا تھا تو بھی جیسے سُونگھ کر اس نے معلوم کر لیا کہ اس میں غیرت کو آگ لگانے والی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اسی وقت وہ آگ بگولا ہو گیا اور غضب ناک سُرخ سُرخ آنکھوں سے چولھے کی بغل میں دبکی ہوئی زرینہ کی طرف دیکھتے دیکھتے بڑھا اور دو ایک زور کی لاتیں مار کر واہی تباہی بکنے لگا۔ بیگماں نے ہوشیاری یہ کی کہ اسے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی ورنہ وہ تو اس وقت اس کی کھال

ادھیڑ دیتا یا خون پی جاتا۔ جب وہ کمرے سے نکل کر گرجتا ہوا برآمدے میں گیا تھا تو بیگماں کھڑکی سے نیچے دیکھ کر چلائی "یہی ہے منشنڈا حرامزادہ ہمارے گھر کا چین برباد کرنے والا ـــــ" لڑکا کھڑکی پر بیگماں کو دیکھ کر آہستہ آہستہ سر جھکا کر کھسک رہا تھا۔ عبدالکریم بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُچک کر کھڑکی پہ گیا۔ نیچے نگاہ ڈالی، ایک لحظہ کے لئے کھڑکی سے جدا ہوا اور پھر آ گیا۔ اب کے اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی جس میں آتے ہوئے وہ کارتوس بھر چکا تھا۔ بیگماں اس کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر دیوانہ وار چیخی۔ بچے ڈر کے مارے روتے چیختے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ گئے۔ اور زربنہ جیسے فریاد کرنے لگی۔ مگر عبدالکریم نے اسے ہاتھ کی بھرپور قوت سے پرے پٹخ دیا۔ اس نے سڑک پر بھاگتے ہوئے لڑکے پر نشانہ باندھ کر بندوق کے گھوڑے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ بیگماں نے پھر آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے دونالی کو پکڑ لیا۔ بندوق ٹھائیں کے ایک وحشت ناک دھماکے کے ساتھ چلی اور لڑکا پتھریلی سڑک پر لڑھکتا ہوا اوندھے منہ گر پڑا ـــــ پھر وہ اُٹھ کر ادھر ادھر دیکھے بغیر سرپٹ بھاگ نکلا۔ دراصل بندوق کا نشانہ خطا گیا تھا اور وہ لڑکا صرف خوف و ہراس کے غلبے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔ عبدالکریم کا دل اپنی اس فتح مندی کا تصوّر کر کے خود بخود لہرا اُٹھا اور وہ لہراؤ مہین مسکراہٹ بن کر اُبل اُبل کر اس کے بڑھے ہوئے خط والے چہرے کو لپیٹ میں لینے لگا۔ وہ فخر اور اطمینان کے جذبات کے ساتھ رُک رُک کر، اپنے سر کو ایک طرف جھکائے یوں بلا ارادہ جنبش دینے لگا کہ اگر اس کی خاکستائی رنگ کی قراقلی ٹوپی کا پھندنا ہوتا تو وہ گھڑیال کے پینڈولم کی مانند ڈولنے لگتا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مونچھوں کا تاؤ ٹھیک کرتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کے وسط میں پیڑھی پہ چپ چاپ بیٹھی بیگماں بچے کو گود میں لئے آگ تاپ رہی تھی۔ عبدالکریم بھی حقہ تازہ کرنے کے لئے سرخ سرخ کوئلوں سے دہکتی انگیٹھی کے پاس چوبی پیڑھے پر بیٹھ گیا۔ کچھ بچے شدید ہوا میں باہر نکل گئے۔ کچھ چارپائیوں پر چڑھ کر اچھلنے کودنے لگے۔ مگر زربنہ باپ کی خاموشی کو کسی آنے والے نئے طوفان کی علامت سمجھ کر بستر میں دم سادھے پڑی رہی۔ عبدالکریم حقے کے لمبے لمبے کش لیتا ہوا زمانے کے اونچ نیچ ـــــ وقت کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں اپنی ذہنی بساط کے مطابق غور کرتا رہا ـــــ "لوگ کہتے ہیں جب وہ دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے کیسے دیتا ہے، کب دیتا ہے؟ انہیں دیتا ہوگا جنہیں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔" پھر ایک بھرپور کش لے کر اس نے حقہ ایک طرف رکھ دیا اور اُٹھ کر چپکے سے باہر آ گیا۔ وہاں سے سیدھا عزیزے کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔ منگل کا دن ہونے کی وجہ سے وہاں پہلے ہی قصائیوں کا جمگھٹا ہو رہا تھا۔ فیکو قصائی عبدالکریم کو دیکھ کر اپنی جگہ سے تقریباً اچھل پڑا۔

"زندہ باد عبدالکریم! میں پہلے ہی سوچتا تھا آج اپنے یار کی چھٹی کا دن ہے مگر ابھی آیا نہیں۔"

"استاد کیا بتاؤں، بس گھر کے جھمیلوں میں پھنسا ہوا تھا" عبدالکریم فرش پر بچھے بوریے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور پھر پانسہ لڑھکنے لگا اور شام تک لڑھکتا رہا۔ جیبیں خالی ہوتی رہیں ـــــ شام کو جب عبدالکریم کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھا تو اس کے ہاتھ بھی خالی تھے ـــ اور جیب بھی ـــ جیب جو بہتر مستقبل کے لئے اور بہت سی دولت اکٹھی کر لینے کی آرزو لے کر کھیلا تھا، رہی سہی پونجی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

رات کو وہ چپ چاپ سا گھر میں داخل ہوا اور بیگماں کے بار بار کہنے کے باوجود کچھ کھائے پیئے بنا نڈھال سا ہو کر لیٹ گیا ـــ ایک بے حس و حرکت لاش کی طرح ـــــ

دوسرے روز شام کو دوکان بند کر کے آیا تو آتے ہی وہ برآمدے میں جا کر غیر ارادی طور پر کھڑکی سے لٹک کر باہر جھانکنے لگا۔ اس کی امید کے عین مطابق گلی سنسان، آہنی جنگلہ خالی اور ٹیلے میدان میں جھکڑ کے باعث بگولے اڑ رہے تھے۔ اس کا دل ایک گونہ قیمتی آرام اور سکون سے لبریز ہو گیا۔ وہ مسرور انداز میں کھنکارا اور حسب عادت بلغم کا غلغلہ زبان کے زور سے کھڑکی کے نیچے سڑک پر تھوک دیا۔ کمرے میں آ کر اس نے بیگماں کے گول مٹول بھرے بھرے گالوں والے چہرے پر یوں نگاہ ڈالی جیسے کوئی قصاب آنکھوں کو ترازو بنا کر کسی بھیڑ کے بدن پر ابھرے گوشت کا جائزہ لے رہا ہو۔ بیگماں کے

ہاتھ سے گرم گرم چائے کا پیالہ لیتے ہوئے عبدالکریم کے ذہن کا سارا تکدر اور دن بھر کی بک بک اور ماپ تول سے پیدا شدہ ساری تکان آن کی آن میں کافور ہو گئی۔ اس نے کہا "بیگو ذرا ہاتھ کشادہ ہوئے تو تیرے لئے کانٹوں کی جوڑی ——" عبدالکریم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو بیگماں نے آنکھوں اور سر کے اشارے سے اسے بچیوں کے جاگنے کا احساس دلایا۔

"بس بس۔ مجھے تو رہنے دو —— زرینہ کے زیور کی فکر کرو —— زیور کی۔ آخر کب تک جوان لڑکی کو گھر میں بٹھائے رکھو گے۔ غریب گھر کے لئے جوان لڑکی ایک میت سے کم نہیں ہوتی۔" عبدالکریم کی طبیعت کی ساری شگفتگی اور ترنگ سراسیمگی میں ڈوب گئی۔ ایک دم سے چائے کے گرم گرم میٹھے گھونٹ اُسے زہر کی طرح تلخ اور ٹھنڈے محسوس ہونے لگے۔

"ادھر سے بھی میں غافل نہیں زرینہ کی ماں! کاروبار کا ہزار مندا ہو پر جتن تو کرتا رہتا ہوں۔ مگر کبھی سے بھی خالتو چار پیسے ہاتھ نہیں لگتے۔ اللہ اپنا فضل ہی کرے۔"

زرینہ اور صغری بستر پر لیٹی ان کی باتوں پر کان لگائے دیر تک جاگتی رہیں۔ ابھی ان کی آنکھ لگی ہی تھی کہ باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے کے ساتھ ساتھ زرینہ کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کا چھوٹا بھائی اسلم تھا۔ جو رات گئے تک آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔ کبھی مال پر لڑکیوں کے تعاقب میں اور کبھی بڑی عمر کے اپنے دوستوں کے ساتھ —— تنہا اور ویران جگہوں میں —— عبدالکریم نے اسلم کو دیر سے آنے پر پھر ڈانٹا۔ مگر وہ اتنا چکنا گھڑا تھا کہ روز گالیاں کھاتا۔ اور روز دیر سے آتا تھا۔

ابھی زرینہ کے لئے جھگڑے پکھڑے ہوئے اور میدان میں جمع ہونے والے لڑکوں کا چرچا سرد نہیں پڑا تھا کہ ایک روز شام کے جھٹپٹے میں اسلم نے بڑی کے لڑکے کو سیڑھیوں پر زرینہ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ اسلم نے اپنی آوارہ گردی کے دوران سیکھی ہوئی تمام گالیاں دے ڈالیں۔ اور گھونسے لاتیں ملنے کے علاوہ مقابل کو چت گرانے کے تمام داؤ پیچ استعمال کر ڈالے۔ بیگماں چق کے پیچھے سے سر نکال نکال کر کوسنے لگی۔ وہ بار بار یہی کہتی تھی ——

"زرینہ کے باپ کو آنے دے وہ اسے بندوق سے اڑا دے گا۔"

عبدالکریم کو گھر آنے پر جب اس کیفیت کا علم ہوا تو گویا اس کے آہستہ آہستہ مندمل ہونے والے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ اب کی بار اس نے گھر میں ہنگامہ بپا تو کیا۔ اپنی عزت کے دشمن کا خون پینے کی قسم بھی کھائی مگر ساتھ ہی ساتھ سیزن کے اختتام سے پہلے پہلے اس نے ہلی ہوئی چولوں والے اس مکان کو چھوڑ دیا۔ جو بے حد خستہ حال تھا۔ جس مکان کی بنیادیں ہی کمزور ہوں اس کا بھلا کیا اعتبار؟

عبدالکریم وہ محلہ چھوڑ کر جبیل اسٹیٹ کے جس نئے مکان میں منتقل ہوا وہ پہاڑ کی ترائی میں نئی چھوٹی سی آبادی میں تھا جو سیٹھ جمیل نے حال ہی میں تعمیر کرائی تھی۔ عبدالکریم نے ایک چو منزلہ بلڈنگ کے جس درمیانے مختصر سے فلیٹ میں رہائش اختیار کی۔ گو اس کا کرایہ پہلے مکان کی نسبت دگنا تھا پھر بھی وہاں کا ماحول صاف ستھرا اور رنیا تھا۔ نئے خوش پوش ہمسائے تھے۔ با اخلاق اور تہذیب سے آراستہ۔ گو سیزن کے قریب الاختتام ہونے کے باعث سیاح آہستہ آہستہ کھسک رہے تھے۔ پھر بھی اکا دکا فلیٹ آباد تھا۔ اور ان کے گھروں سے اکثر پوری رفتار پر چھوڑے ہوئے خلی گلوں کی آواز بلند ہوا کرتی تھی۔ زرینہ کا دل یہاں آ کر بالکل دنگ۔ مگر اُس کی یہ کیفیت زیادہ دنوں قائم بھی نہ رہی۔ جلد ہی اس کا نئے صاف ستھرے ماحول سے دل لگ گیا۔ کھلی آزاد فضا نے اس کے دل میں نئی امنگیں اور نئی آرزوئیں بیدار کیں۔ اور نئی رنگین اور دلآویز کیفیتیں اُجاگر کرنا شروع کر دیں۔ اب پہلے سے زیادہ وہ اپنی تند و جوانی کی اٹھان اور بناؤ سنگھار کے معاملے میں دلچسپی لینے لگی۔ بہترین خوشبوئیں استعمال کرنے لگی اور گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی بناؤ سنگھار میں محو رہنے لگی۔ جیسے وہ گردہ آخری نظر اپنے سراپا پر ڈالتی —— پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، دل آویز تیکھے نقش بھرپور بدن۔ گھنی بھنویں، سرمگیں کٹاری سی آنکھیں اور رخساروں پر گلاب کی پنکھڑیوں ایسا سفید اور سرخ رنگت کا حسین امتزاج —— تو یہ سب کچھ دیکھ کر اپنے آپ پر فریفتہ سی ہو جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بے اختیار اپنے آپ کو چوم لے۔ جب وہ غرورِ حسن سے سرشار سی ہو کر بیٹھی

چال کے ساتھ گنگناتی۔ اٹھلاتی ہوئی سی سنگین برآمدے میں چہل قدمی کرتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اس گنگناتی فضا اور حسین وادی کی ملکہ ہے۔ تب اسے دیکھ دیکھ کر شام کی سرمئی فضا کلیجہ تھام کر رہ جاتی اور خنک ہوا چلتے چلتے آہ بھر کر جیسے رُک جاتی۔ بیگماں اس تبدیلی کو دیکھ کر سوچنے لگی۔

"اللہ خیر کرے لڑکی نے پھر پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔" پھر وہ اسے نئی جگہ اور اس کی فضا کا اثر سمجھتی۔ پھر جلد ہی وہ زرینہ کو بناؤ سنگھار سے منع کرنے کی بجائے اس کی ٹوہ میں رہنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد جب اس پر یہ کھلا کہ زرینہ کی اس حیرت انگیز تبدیلی کی اصل وجہ بغلی فلیٹ میں رہنے والا وہ خوبصورت نوجوان ہے جسے شام کے جھٹپٹے میں زرینہ خط دیتی لیتی ہے تو بیگماں نے یہ بات اپنے تک ہی محدود رکھی۔ پھر بھی اس بات کی بھنک عبدالکریم کے کانوں تک بھی پہنچ ہی گئی اور وہ کسی ایسے وقت کی تاک میں رہنے لگا جب وہ موقعہ پر پکڑ کر دونوں کو دونالی بندوق کا نشانہ بنا دے۔

ایک شام اسے دکان بند کر کے گھر آتے ہوئے دیر ہو گئی۔ جمیل اسٹیٹ کے احاطے میں داخل ہوا تو دور ہی سے اسے اپنا گھر برق کی تجلیوں میں روشن نظر آیا۔ پھر اس نے اس آبادی میں گھومتے ہوئے پکے راستے کے دو ایک موڑ کاٹے تو اس ملگجی سی روشنی میں گھر کے کھلے برآمدے میں جیسے کسی کا سایہ متحرک دیکھا۔ ایک اور بلڈنگ کا چکر کاٹ کر جب وہ گھر سے اور بھی قریب ہوا تو اس نے اُدھر سے مکانوں کی دو رویہ قطاروں کے بیچ کے خلا میں سے ایک پل کے لئے رُک کر دیکھا۔ اس کے مکان کی بغلی بلڈنگ کے برآمدے میں کھڑا آہنی ریلنگ پر جھکا کوئی شخص ملحقہ برآمدے کے جنگلے پر جھکی زرینہ کا ہاتھ چوم رہا تھا۔ اس کے تیز رفتار قدم چلتے چلتے ایک دم بوجھل ہو گئے۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ پتھریلی بجری پر نہیں، شیشے کی مانند انتہائی نازک کسی پُل پر سے گزر رہا ہے۔ جہاں کی ذرا سی پھسلن اُسے منہ کے بل گرا دے گی۔ پھر اسے اپنے بدن پر کپکپی کے دوران محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں کے نیچے شیشے کا نہیں کنکریٹ کا نیا فرش ہے، اور اس کے پاؤں سنگین فرش کی اُبھری سطح کے ساتھ جیسے چپکے جا رہے ہوں ——— جب وہ گھر کے سامنے پہنچا تو اس کے قدموں کی چاپ سُن کر جاگتے برآمدے جیسے ایک دم سو گئے۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی بیگماں کو آواز دی پھر اس پر برسنا شروع کر دیا۔ چارپائی پر آنکھیں میچے لیٹی ہوئی زرینہ پر گھونسوں لاتوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

"بے شرم۔ کمینی ——— تو ضرور ناک کٹوا کر رہے گی۔" رات بھر عبدالکریم ملحقہ بلڈنگ میں رہنے والے نوجوان کو گالیاں دیتا رہا ——— اپنے دل میں پیچ و تاب کھاتا، جیسے انگاروں پر لوٹتا رہا۔ صبح وہ اٹھا تو بیگماں کی نظریں بچا کر الماری سے بندوق نکال لی۔ اسے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور اس میں کارتوس بھر کر کندھے پر لٹکائے چپکے سے بغلی بلڈنگ والے نوجوان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک دی تو اندر سے شب خوابی کے لباس پر عمدہ کپڑے کا گاؤن پہنے ہوئے مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا ——— "خوش آمدید ——— خوش آمدید۔ آیئے تشریف رکھیے۔" نوجوان نے خندہ پیشانی سے عبدالکریم کا استقبال کرتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ پر عبدالکریم آنکھوں میں سرخ چمک لئے غضب ناک حالت میں بدستور کھڑا رہا ——— ایک ہی نظر میں اس نے شاندار صوفوں دبیز تہہ والے ایرانی قالین، سنہری فریم کی قیمتی تصویروں، چاندی کے ایش ٹرے اور ریشے کے گلدانوں سے آب و تاب اور خوبصورتی پانے والی اُس فضا کا جائزہ لے لیا۔

نوجوان نے کہا "کیا آپ شکار کھیلنے جایا کرتے ہیں؟ مجھے بھی شکار کا بڑا شوق ہے۔"

عبدالکریم خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ نوجوان مسرت بھرے لہجے میں پھر بولا ——— "میرا نام انور ہے۔ میں سیٹھ جمیل کا منجھلا بیٹا ہوں۔ آپ تشریف تو رکھئے ناں ——— کھڑے کھڑے کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" نوجوان نے عبدالکریم کا بازو پکڑ کر اسے زبردستی صوفے پر بٹھا دیا اور خود ملازم کو آواز دیتا ہوا اندر چلا گیا۔ ایک ہی سیکنڈ بعد جب وہ آیا تو عبدالکریم بندوق سیدھی کر کے بغل میں داب کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ———

"بس اب میں جاتا ہوں۔ زرینہ کی ماں نے کہا تھا، بابو صاحب سے جا کر کہہ دیں ——— بابو صاحب سے کہہ دیں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو منگا لیا کریں۔ شرم بالکل نہ کریں۔"

مصنف: ایم۔ کے۔ رالنگز
مترجم: نور حسین عزیز

معافی

قید خانے کے بڑے دروازے پر شاہ بلوط کے خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آدمز نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کے کالر اوپر چڑھا لئے ـــــ گہرے بھورے رنگ کے نومبر کے آسمان میں گہرے نیلے رنگ کے دھبے بڑے حسین معلوم ہو رہے تھے پاسبان نے جو دروازے پر کھڑا تھا کہا ـــــ "اب کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا دوست! یہاں واپس آنا بڑی بدقسمتی ہے۔"

یک لخت لوگوں کا ہجوم ہنسنے لگا۔

ایک عمر قیدی بولا "یہ اور بھی بدقسمتی ہے کہ ـــــــــ" لوگ پھر ہنسنے لگے۔ اور قیدی کی آواز قہقہوں میں ڈوب گئی

آدمز نے اپنے ہاتھ کوٹ کے اندر کر لئے اور جیب میں رکھے ہوئے معافی نامہ کو ٹٹولنے لگا۔ وہ معافی نامہ کی نمائش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب سے ادھر نکل گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "الوداع"

پاسبان نے بے دھیانی سے الوداع کہی۔ اور ریت پر تھوک دیا۔ لوگ چپ ہو گئے۔ چپ چاپ، گم سم۔ وہ موقع کی نزاکت کو سمجھ گئے تھے۔

آدمز باہر نکل آیا۔ اور سڑک پر ملاقاتیوں کی کاروں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک عورت دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اسے اشارہ کیا۔ اور پھر ایک دم مڑ گئی آدمز نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ "ایما" تھی۔ اس کے پاؤں تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ اس کی رگوں سے سارا خون اکٹھا ہو کر اس کے منہ پر آگیا۔ کار کے قریب ہی جو پیٹر کھڑا تھا۔

"ہے پیٹر!"

"ہے" پیٹر نے جواب دیا۔ اور موٹر پر جھک گیا۔

آدمز اپنی بیوی کی طرف مڑا۔ "ہے مسز"

عورت نے آنکھیں اٹھائیں۔ اور اپنے خاوند کو دیکھنے لگی۔ آدمز نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اسے خرگوش سے ملتی جلتی نظر آئی۔ وہ سوچنے لگا پہلے تو وہ ایسی کبھی دکھائی نہ دی تھی۔ جب وہ قید خانے کے فارم میں رہا کرتے تھے۔ تو انہوں نے کئی خرگوش مارے تھے۔ ان کی آنکھیں گھبرائی ہوئی اور نتھنیں کانپتی تھیں۔ وہ دم سادھے بیٹھے رہتے تھے۔ گویا ان کو کوئی نہیں دیکھ رہا۔

"لڑکیاں نہیں آئیں؟" اس نے پوچھا۔

عورت نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "میں مناسب نہیں سمجھتی کہ انہیں ہر جگہ گھسیٹتی پھروں۔ یہی وجہ ہے یہاں نہیں لائی۔"

"ہونہہ!" وہ چپ ہو گیا۔

جو پیٹر نے دروازہ کھولا۔ اگلی یا پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے جھجکا۔ اور پھر اپنے آپ کو پچھلی سیٹ پر گرا دیا۔

عورت نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہنے لگی "میرے خیال میں ہم ایکلے اس سیٹ پر زیادہ مزے میں رہ رہے گے" اور فوراً جو پیٹر کے پہلو میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"پورے سات سال قید میں گذارنے کے بعد آدمز کا کار میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقع ہے۔ کیوں ایما؟" جو پیٹر بولا

آدمز اپنی بیوی کی گردن دیکھ رہا تھا۔ گردن گداز تھی۔ اور اس پر بکھرے بکھرے بال بڑے حسین معلوم ہو رہے تھے۔

کار قید خانے سے ہٹتے ہوئے ایک کچے راستے پر دوڑنے لگی تھی۔ راستہ اونچا نیچا تھا۔ آدمز گدی کے سپرنگوں پر مینڈک کی طرح ادھر ادھر پھدک رہا تھا۔ نیئے موسموں کی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے اپنی سیاہ فیلٹ ہیٹ مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ کار فراٹے بھرتی جارہی تھی۔ قید خانے کا ہوم نظروں سے اوجھل ہوا۔ فارم سے نرسری، نرسری ڈیری فارم۔ ڈیری سے چراگاہ، چراگاہ سے کھیت اور پھر کھیت ہی کھیت ـــــــ پل سے گذر کر کار شاہ بلوط کے جنگل میں داخل ہو گئی

کوئی نو میل اُدھر کار کچے راستے سے ہٹ کر پکی سڑک پر آگئی تھی۔ اور بڑی ہم آہنگی سے چلنے لگی تھی۔ بلوط دوڑتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے سائے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ وہ خود بھی خیالات میں کھو گیا۔ اس کو قید خانے کے ہسپتال میں بیماری کی وجہ سے ایک دفعہ گیس دی گئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ اُسے اپنے جسم میں دوڑتے ہوئے خون کا احساس تھا۔ کانوں میں پڑتی ہوئی ہوا کی سائیں سائیں کا لمحہ بہ لمحہ چاروں طرف بڑھتی ہوئی تاریکی کا۔ سب کا احساس تھا۔ اسے ہر لمحہ کا احساس تھا۔ جو اس کی خواہش اور کوشش کے بغیر گذر رہا تھا۔

جو نے ایما سے بات چھیڑی "جب ہم گھر پہنچیں گے۔ تو بہت اندھیرا ہو چکا ہوگا"

آدمز نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس نے محسوس کیا۔ گویا وہ خیمے کے ساتھ کا نوکر یا کسی دریا جو کی لاش ہے۔ وہ جو کو بتانا چاہتا تھا۔ کہ وہ انسان ہے۔ اور انسانوں جیسی توجہ کا مستحق ہے۔ وہ آگے کو جھکا۔ اور اگلی سیٹ کی پشت کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کسی نے بھی اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ نہ اسے خود ہی کوئی بات سوجھی۔ وہ دوبارہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ معافی نامہ اس کی جیب میں چر مر کرنے لگا۔ وہ اس وقت اس بچے کی مانند تھا جیسے سکول میں پہلا سبق بھول گیا ہو۔ بالآخر وہ بولا "کبھی میرے خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ کہ مجھے معافی مل جائے گی"

کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے سوچا شاید کسی نے سُنا نہیں۔ وہ حیران سا ہو گیا۔ اسے شک ہو گیا کہ اُس نے کچھ کہا بھی تھا یا نہیں۔ اس وقت وہ یہی کر سکتا تھا۔ کہ بات چلانے کے لئے دوبارہ بولے اور آواز ذرا اونچی رکھے۔

"کیا کسی اور نے بھی نہ سوچا تھا" جو نے اچانک سوال کر دیا۔

کار اس کے جانے پہچانے دہاتوں سے گزر رہی تھی۔ بس ہائی کے دلدل کے قریب قمریوں اور فاختاؤں کے غول رین بسیروں کو لوٹ رہے تھے۔ پیلی دھوپ میں ان کے پر نارنجی اور گلابی نظر آرہے تھے۔ مگر دور افق پر جا کر وہ سیاہ ہو جاتے تھے۔ وہ دلدل سے اُڑتے اور دلدل ہی میں غائب ہو رہے تھے شاید ان کے رین بسیرے بھی یہیں تھے۔

"ہم شوف کے کھیتوں سے ہزاروں کماتے تھے۔ ایما اب کے بھی شوفا ہے؟"

ایما نے اپنے کندھوں پر سے اُدھر دیکھا۔ اور آہستگی سے سر ہلا دیا۔

"بے چاری تو کچھ بھی پیدا نہ کر سکتی تھی۔ جو بوتی، لوگوں کے مویشی کھا جاتے تھے۔ کھیتوں کے جنگلے بیکار تھے۔ بالکل بے کار۔ ہم نے نہیں جگہ جگہ درست کیا۔ کہیں نیا جنگلہ لگایا۔ کہیں پہلے ہی کی مرمت کی۔ تب کہیں جا کے ان کی کوئی صورت بنی"

"جو نے ہماری پرانی چمنی بھی بنا دی ہے۔ جو میں شاید کبھی بھی نہ بنا سکتی" ایما نے بات بڑھائی۔

کار بس شاہراہ چھوڑ چکی تھی۔ اور پتلے راستے پر چل رہی تھی۔ یہ راستہ بس بائی کے گھنے جنگلات سے گذر کر فارم تک جاتا تھا۔ ہوا بڑی تیز ہو گئی تھی۔ چیل کی کومل شاخیں ہوا کے زور سے جھکتیں اور کار کی چھت سے ٹکرا کر عجیب سی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ آدمز نے پہلے دیکھے بھالے کھیتوں پر نظر ڈالی۔ وہی چوپالوں کا بڑا استھان وہی غیر آباد کنواں، وہی پرانا جوہڑ، جہاں وہ اپنے مویشی نہلایا کرتا تھا۔ سب منظر دیکھے بھالے تھے۔ مگر موڑ مڑتے ہی اسے ایک عمارت نظر آئی۔ بھوری، سیاہی مائل خاموش سی، وہ آنکھیں جھپکنے لگا۔

کار دروازے کے باہر ٹھہر گئی۔ چنار بری کے درخت مکان سے سر نکال رہے تھے۔ ان کی شاخوں سے چھنتی ہوئی چاندنی زمین پر روشنی اور اندھیرے کی کئی ہولی بھلیاں بنا رہی تھی۔ آدمز دروازے سے گذر کر راستے پر چلنے لگا۔ مکان غیر آباد سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ مگر اس کے ذہن میں اس کی حیثیت ایک یاد سی رہ گئی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ کار کا دروازہ بند کر رہی تھی۔ اس نے جو اور ایما کو اپنے ساتھ لانے کے لئے، اپنی رفتار آہستہ کر دی۔

پہلی نظر میں باورچی خانہ اُسے بالکل خالی نظر آیا۔ وہ آنکھیں جھپکنے لگا۔ ایک کمرے میں لکڑیوں کی آگ جلتی نظر آ رہی تھی۔ نیم اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے پر کھڑکیاں کھلیں۔ اور دو بچوں کے حیران، و ششدر چہرے دکھائی دینے لگے۔

آدمز انہیں دیکھتے ہی بول پڑا۔ "تم گریسی اور لیسلا ہو گیا! بولو؟"

"رفلیو! تم دیا بھی نہیں جلا سکیں۔ لوگ کب تک تمہیں سمجھاتے رہیں گے۔" جو نے غصے سے کہا۔

ایما بولی۔ "تم چپ رہو۔ میں خود جلا لوں گی۔ تم جاؤ ایک گٹھا لکڑیاں اٹھا لاؤ۔ اور تم لڑکیو، اِدھر آؤ۔ اپنے باپ سے ملو۔"

مٹی کے تیل کے دیئے کی روشنی میں لڑکیاں ملگجی سے ڈھانچے معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ بے حسی سے آگے بڑھیں۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ دونوں بھی خرگوش ہی کی طرح ہیں۔ ڈری ڈری، سہمی سہمی۔ مگر یہ کتنی بڑھ گئی ہیں۔

"گریسی! تم تو اب میرے جتنی ہی ہو گئی ہو۔ میں سات سال باہر رہا ہوں۔ تم تیرہ برس کی ہو گی۔ اور لیسلا تو غالباً دس سال کی۔" اس نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ وہ بالکل نہیں ہلیں۔

"گریسی! گوشت پکاؤ۔ ہم بہت بھوکے ہیں۔" ایما لڑکی سے مخاطب ہوئی۔

آدمز کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ کھانا برابر کے کمرے میں پک رہا تھا۔ جو پچھلے دروازے سے آ گیا۔ وہ لکڑیاں لے آیا تھا۔ اس نے نلکے پر اپنے ہاتھ دھوئے۔ اور شیشے کے پیچھے سے کنگھی نکال کر اپنے کھردرے اور گھنے بالوں کو درست کرنے لگا۔

"بیٹھو! جوان!" وہ آدمز سے بولا

ایما تیزی سے بولی۔ "پہلے اسے جیل کی نحوست اتارنے دو۔ تم پھر منہ ہاتھ دھو لینا۔"

آدمز سرخ ہو گیا۔

"ہم وہاں بڑے صاف ستھرے رہتے تھے۔ ہمارے پاس بہت پانی ہوتا تھا۔ تم میرے کپڑے نہیں دیکھ رہیں۔ بالکل صاف ہیں۔"
جو نتھنے پھلا کر بھنتے ہوئے گوشت کی بو سونگھنے لگا۔

جیل میں کیڑے مکوڑے مارنے اور بدبوئیں دور کرنے کی دواؤں کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ آدمز نلکے کی سمت بڑھتا ہوا بولا۔
اُس نے اپنا منہ اور ہاتھ بڑی احتیاط سے دھوئے۔ تولیے کا کونہ بھگویا۔ اپنی گردن پر رگڑا۔ اپنے بالوں کو درست کیا۔ اور دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی نے بسکٹوں کی ایک پلیٹ اس کے سامنے دھر دی۔ جب وہ جانے لگی۔ تو اس نے اس کی اسکرٹ کا پلو پکڑ لیا۔ "ایما! میرے بیٹے کہاں ہیں؟ مجھ

سے دور ہی رہو گی۔"

دونوں حیرانی سے اُسے دیکھنے لگیں۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ ایک گرم گرم رکابیاں لے آئی۔ وہ منہ کا جواب دے رہی تھی۔ اس نے اپنی پیشانی سے بالوں کی لٹ ہٹائی۔ اپنی بیوی کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ اس کے احساسات شاداب ہو گئے۔ کئی پرلطف یادیں سلیقے سے گندھی ہوئی چوٹیاں اور پھر اس کا مجنونانہ انداز میں پیشانی سے لٹ ہٹانا، آدمز کو سب باتیں یاد آ گئیں۔ اور اس کی آنکھیں ایک لمحے سرور سے بند ہو گئیں۔

دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ اور آواز کے تھمتے ہی مسٹر اور مسز موبلے باورچی خانہ میں داخل ہوئے۔ آدمز ان کی پیشوائی کو لپکا۔ وہ خوش ہوا۔ کہ یہ لوگ پہلے روز ہی اس کی خیریت پوچھنے آ گئے ہیں۔

یانے آہستگی سے بڑی لڑکی سے کہا۔ کہ وہ چیکی کو لے آئے۔ وہ جھنجھلا کر اٹھی اور ایک چار سالہ بچے کو ساتھ لئے واپس آئی۔ بچہ آنکھیں مل رہا تھا۔ آدمز نے بچے پر سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر موبلے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ موبلے اور اس کی بیوی بہت چوبند اور بنے سنورے تھے۔ رسمی تکلف کے بعد وہ بھی کھانے میں شامل ہو گئے۔ باورچی خانے میں چہل پہل ہو گئی۔

کھانا کھاتے ہوئے موبلے نے کہا "میں تمہیں مجرم نہیں گردانتا۔ دو آدمیوں کی لڑائی میں ادھر بھی کب سکتا تھا۔ لیکن لوگ سمجھتے ہیں۔ اگر تم دلبر کو اٹھا کر جیل میں نہ پھینک دیتے تو وہ تمہیں پھینک دیتا۔ تم ڈوب جاتے۔ اور آج تمہاری بجائے وہ قید ہوتا۔

سپرنٹنڈنٹ نے بھی مجھے معافی دیتے ہوئے یہی کہا تھا کہ یہ سب کچھ اپنے بچاؤ کی خاطر ہوا تھا۔ اور یہ قتل عمد نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ موت بھیانک تھی۔ مگر اس کے لئے بیس سال قید اور بھی بھیانک ہے۔"

موبلے نے منہ سکیڑا۔ "مگر دوسرے ہمسائے میری طرح نہیں سوچیں گے۔ ورنہ وہ تم سے مل کر یہ نظریہ ہی قائم کریں گے۔ آخر جیل، جیل ہے۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔" آدمز شائستہ لہجے میں بولا۔ "آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔" اور پھر خوشی سے بولا "آپ معافی نامہ دیکھیں گے؟" وہ کرسیوں پر آگے کو جھک گئے۔

"میری بڑی دیر سے خواہش تھی کہ میں کوئی معافی نامہ دیکھوں۔" مسز موبلے بولیں۔

معافی نامے کے ذکر سے باورچی خانے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ آدمز نے آہستگی سے کوٹ کی اندرونی جیب سے معافی نامہ نکالا۔ اور اسے کھولنے لگا۔ چراغ کی روشنی میں بڑی مہر چمکنے لگی۔ اس معافی نامے کا کاغذ سفید اور موٹا تھا۔ مکتوب کی تتلی کی طرح۔ مسز موبلے نرم چکنے کاغذ پر اپنی انگلیاں پھیرنے لگی۔

"کیا گورنر نے اس پر خود دستخط کئے؟" مسٹر موبلے نے پوچھا۔

آدمز نے شکستہ حروف کی طرف اشارہ کیا۔ "ہاں اُسی نے مجھ پر مہربانی کی۔"

موبلے نے دستخط پڑھے۔ "معمولی لکھائی ہے۔ ہر آدمی ایسا لکھ سکتا ہے۔"

آدمز نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تو نہیں۔ میرے خیال میں وہ ایسے کاغذات پر دستخط کرنے میں خوش خطی کا خیال نہیں کرتا ہو گا۔" چار سالہ بچہ آہستہ آہستہ رونے لگا۔

گریسی نے سرگوشی کی۔ "لیلا! اسے دینے میں یخنی ڈال دو۔ تم جانتی ہو کہ وہ خالی دیا نہیں کھاتا۔"

مسز موبلے بولیں۔ "میرا خیال ہے۔ جیل سے آنے کے بعد گھر کا کھانا زیادہ لذیذ معلوم ہو گا۔"

بات معافی نامے سے شروع ہو کر کھانے کی میز تک آ پہنچی تھی۔ آدمز کے خیال میں جیل کا کھانا اس کھانے سے کہیں بہتر تھا۔ لیکن وہ گھر والوں کا دل

نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ بولا "ہمیں جیل میں بہت اچھی خوراک ملتی تھی۔ مگر کھانے میں تنوع نہیں ہوتا تھا تقریباً ہر روز لوبیا کھانے کو ملتا۔ بعض لوگ یکساں خوراک سے اکتا بھی جاتے تھے۔ مگر قہرِ درویش برجانِ درویش کھانا ہی پڑتا تھا۔ خواہ آپ بھوکوں مریں خواہ پیٹ بھر لیں۔"

موبلے اور جوپیٹر اس کے ساتھ ہنسنے لگے۔ اس کی بے حسی ختم ہو گئی۔ اُسے اپنے ماحول کا احساس ہونے لگا۔ کمرے میں گرمی تھی۔ چولہے میں لکڑیاں جلنے سے بے ہنگم سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگیں میز کے نیچے پھیلا دیں۔ فرش پر لگے ہوئے چوڑے تختے اس کے پاؤں کو سخت محسوس ہو رہے تھے۔

"اگر جانا پہچانا فرش نظر نہ آئے۔ تو کتنا عجیب لگتا ہے۔ اُدھر والا فرش سمینٹ کا تھا" وہ بولا اس کی نگاہوں میں قید خانے کا منظر گھوم گیا۔ بنگلے کی سی سفید عمارت، جدید ترین نمونہ، چمکدار اور خوبصورت، اسے دھندلا سا خیال ہوا۔ کہ یہ دوزخ اور بہشت کے درمیان ایک موڑ تھا۔ جہاں بدقسمت لوگ صاف ستھرے، ماحول میں تکلیفیں برداشت کر رہے تھے۔ وہ ایک بھورے اور بالکل سادہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں آگ روشن تھی۔ نومبر کے اندھیرے میں یہ جانی پہچانی دنیا تھی، اور وہ اس دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ اس کی پوریں اور انگلیاں شدّتِ احساس سے سنسنانے لگیں، جیسے زندگی اسے ڈس رہی ہو۔ سوئیاں چبھو رہی ہو۔

دونوں لڑکیاں اور بچہ بچپن کی نیند سے بوجھل، اور بیقرار آنکھیں لئے کرسی پر بیٹھے تھے۔ موبلے اور اس کی بیوی ملکی خبروں پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ایا بولی "مجھے اب میز صاف کر دینی چاہیئے" لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے ہاتھ بل رہے تھے۔ کبھی چکنے میز پوش کا کونہ پکڑتی۔ کبھی اپنے بکھرے بالوں کو درست کرنے لگتی۔ جوپیٹر نے اپنا پائپ بھرا۔ اور اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ موبلے اور اس کی بیوی جانے کے لئے اٹھے۔ مسز موبلے نے آدمز سے دور کر یاں تک چھپاتی نظر دوڑائی اور پھر جوپیٹر پر نظر جما دی۔ اور سدھم لہجے میں بولی۔ "مسٹر جو آج تم ہمارے ہاں ٹھہرو گے؟"

وہ ایک لمحہ چپ رہا۔ پھر آہستگی سے اٹھا۔ اور چولہے سے پائپ جھاڑنے لگا۔ "ہاں! یہی بہتر رہے گا" اور پھر ان کے ساتھ چل پڑا۔

"تم تو صبح آلو کھودنے کی سوچ رہے تھے" ایا نے اسے آواز دی

"میں تمہیں اس کے متعلق بتا دوں گا" اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

آدمز نے انہیں دروازے پر چھوڑا۔ اور خود بڑے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا۔ بستر پر اس کی پسندیدہ رضائی رکھی تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا جب موبلے اور جو چلے گئے۔ تو باہر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ ایا اس کے قریب سے گذر کر سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ اور صندوق پر جھک کر اور رضائیاں نکالنے لگی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں آیا۔ اور چپکے سے اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈالا۔ وہ اسے پہلے کی نسبت گداز محسوس ہوئی۔ لیکن اس کا چہرہ پرسکون اور کسی تاثر سے خالی تھا۔

"ایا!"

ایا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نگاہیں رضائیوں والے صندوق پر جمی تھیں۔

"میری جان! میرے ساتھ یہ تغافل نہ برتو۔"

ایک رضائی زمین پر گر گئی۔ وہ بے دھیان ہو گئی تھی۔

"مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں، جب ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے تھے۔" وہ بولا

بڑی مایوسی سے بولی "تمہیں اب بھی میرے قریب رہنے کا حق حاصل ہے۔ قانون نے تمہیں اجازت دے رکھی ہے۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔

"قانون کو ایسی باتوں سے نسبت دینے سے مجھے سخت نفرت ہے۔" وہ جھلا گیا "تم مجھے کچھ اجنبی سا محسوس کر رہی ہو۔"

وہ سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کی پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ سامنے رضائیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آنکھیں سہمی ہوئی گھوڑی کی طرح کھلی تھیں۔ جذبات پر قابو پانے کے لئے وہ باورچی خانے کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں لڑکیاں رکابیاں صاف کر رہی تھیں۔ چار سالہ بچہ کتے کے پلّے کی طرح ٹانگیں سمیٹے چولہے کے سامنے فرش پر سو رہا تھا۔ آدمز کی نظر بچے پر پڑی۔ ایک گھناؤنے احساس نے اُسے ہلا دیا۔

"ایا" معلوم ہوتا ہے اُسے اپنی آواز بھی بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی ہے۔ "یہ بچہ کس کا ہے؟"

کوئی جواب نہ ملا . . . . . . وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ "میرا خیال ہے یہ مویلے کے ساتھ آیا تھا؟"

بڑی لڑکی بچے پر جھک کر اس کے کپڑے درست کرنے لگی۔ چھوٹی لڑکی باریک آواز میں چلائی "یہ ہمارا بچہ ہے۔"

اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ سن سا ہو گیا۔ منہ ایک طرف موڑ لیا۔ وہ عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مضبوطی سے دیوار سے پشت لگائے کھڑی تھی۔ اور کبھی کبھی دائیں بائیں ہل جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ رضائی اس کے ہاتھوں سے گر پڑی۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اور منہ پر رکھ لیا۔ آنکھیں کھولیں اور آدمز کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

"مجھے زندہ رہنے کے لئے مرد کی ضرورت تھی۔ اس دنیا میں اکیلی عورت کبھی فارم نہیں چلا سکتی۔ جنگلے تقریباً ٹوٹ چکے تھے۔ اور پیوند زمین ہو رہے تھے۔" وہ چلائی۔

آدمز اپنی انگلیوں سے الجھ رہا تھا۔ کبھی غصّے سے مٹھیاں بھینچ لیتا۔ اور کبھی مایوسی سے کھول دیتا۔

عورت سسکنے لگی۔ "ہر انسان میں دوسرے انسان کو معاف کر دینے کا جذبہ ہونا چاہیئے۔"

جانتا ہوں میں ہر ایک دنیا سے دوسری دنیا کو دوڑ رہی تھی۔ کمرے میں سکوت چھا گیا۔ اس کا غصّہ بجھ گیا تھا۔ اور جسم پر افسردگی طاری ہو گئی۔ وہ سونے کے لئے چھوٹے کمرے کی طرف مڑا۔

"مجھے کہاں سونا ہے؟"

"ابھی بتاتی ہوں؟"

وہ بستروں کا جائزہ لینے لگا۔

"لڑکیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ تمہارے مل کر سونے میں پلنگ پر جگہ کم ہو گی۔ دوسرا پلنگ یوں بھی بہت زیادہ چھوٹا ہے۔"

گریسی بچے کو اٹھا لائی۔ اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تم اپنے باپ کا بستر بچھاؤ۔ وہ سونا چاہتا ہے۔" ایا لڑکی سے بولی۔

وہ بے دلی سے بولا۔ "تم اور دونوں لڑکیاں بڑا پلنگ لے لو۔"

لڑکی بچے کو لے کر چھوٹے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے کپڑے درست کئے۔ اچھی طرح ڈھانپا اور خود سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر گئی۔

آدمز کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے باورچی خانے میں کپڑے اتارے اور دیوار سے لگی کھونٹیوں پر لٹکا دیئے۔ مٹی کے تیل کا چراغ بجھا دیا۔ اندھیرے نے چاروں جانب سے اسے گھیر لیا۔ کمرے میں سردی تھی۔ مگر اسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تختوں پر سے ہوتا ہوا۔ دروازے تک آیا۔ زور سے کھولا۔ اور ہوا سوئیوں کی طرح چبھنے لگی۔ وہ کانپنے لگا۔ اس نے دروازہ پھر بند کر لیا۔ مگر اس کے ہاتھ غیر یقینی طور پر اب بھی دروازے کی چٹخنی سے چپکے ہوئے تھے۔

اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے وہ کچھ کھو بیٹھا ہے۔ اس نے اپنی پیشانی کو چھوا۔ وہ معافی نامہ بھول گیا تھا۔ اس نے اُسے میز پر ہی چھوڑ دیا تھا جہاں رات کو وہ گم بھی ہو سکتا تھا۔ ہوا کا کوئی جھونکا اُسے چولہے میں گرا دے۔ اور اسے آگ لگ جائے۔ وہ جلدی سے اٹھا۔ راستہ ٹٹولتا ہوا باورچی خانے میں آیا۔ اور معافی نامہ [illegible] رکھ دیا۔ چولہے میں ایک کوئلہ دہکا اور اندھیرے میں معافی نامے کی مہر چمکنے لگی۔ اس نے کاغذ لپیٹا اور کمرے میں چلا آیا۔

بچہ گہری نیند سو رہا تھا۔ آدم خود کو اس کے پاس سلانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے پاؤں ایک دوسرے کے ساتھ لگا کر گرم کرنے لگا۔ اس نے معافی نامہ اپنے ہاتھوں میں بھینچ رکھا تھا۔ کمرہ اس کے گرد ایک سیاہ صندوق کی مانند تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں کو پیٹ پر باندھا اور اپنے جسم کو جھکا کر جھومنے لگا۔ اس لمحہ وہ قید خانے کے تصور میں کھو گیا۔ وہاں روشنی ہو گی۔ اس سے پرے ڈیوڑھی میں آگ جل رہی ہو گی۔ میدان میں بڑی گہما گہمی۔ ننگے بدن سیمنٹ کے فرش پر چل پھر رہے ہوں گے۔ کسی کو تنہائی کا احساس نہ ہو گا۔ کیوں کہ وہاں ہر قیدی کے ساتھ ایک اور بدنصیب بند ہوتا ہے۔ مگر یہاں ... مایوسی اور ناامیدی کی ایک لہر اٹھی۔ اور آدم اس میں ڈوب کر رہ گیا۔

اس کے پہلو میں بچہ بلکنے لگا۔ آدم نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے ہاتھ بڑھائے۔ وہ بچے کے خوب صورت بالوں کو چھونے لگے۔ وہ کانپ اٹھا۔ اور پھر کسی خیال سے رضائی کے نیچے وہ بچے کے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"بے چارہ ننھا بچہ —" وہ بڑبڑایا۔ "میرا خیال ہے تمہاری اتنی ضرورت نہ تھی۔"

بچہ خواب میں زور زور سے چلانے لگا۔ اس کی ٹانگیں اور بازو فضا میں چلنے لگے۔ آدم نے اس کی گردن پر اچھی طرح رضائی لپیٹ دی

"ایک شریف آدمی سے بھاگ رہے ہو۔ ڈرو نہیں۔ میں بھوت نہیں ہوں۔ میں تمہیں سہارا دوں گا بیٹا!" اس نے رضائی نیچے اور کھینچ لی۔ اور معافی نامہ احتیاط سے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔

○

آفریں بر وفائے زنجیرم
ہمرہم نالہ کردہ تا سرِ دار

مجید امجد

○

اَب کے تمہارے دیس کا یہ رُوپ نیارا تھا
بکھرا ہوا ہوا ؤں میں سایا تمہارا تھا
گُم سُم کھڑے ہیں اُونچی فصیلوں کے کنگرے
کوئی صدا نہیں! مجھے کس نے پکارا تھا
رات آسماں پہ چاند کی منڈلی میں کون تھا
تم تھے کہ اِک ستار بجاتا ستارہ تھا
اِن دُوریوں میں قُرب کا جادو عذاب تھا
ورنہ تمہارے ہجر کا غم بھی گوارا تھا
دل سے جو ٹیس اُٹھی، میں یہ سمجھا پجاریو
پتھر کے دیوتا کا تڑپتا اشارہ تھا
تالی بجی تو سامنے ناٹک کی رات تھی
آنکھیں کھُلیں، تو بجھتے دلوں کا نظارہ تھا
پھر لوٹ کر نہ آیا، زمانے گذر گئے
وہ لمحہ، جس میں ایک زمانہ گذارا تھا
بہتی ندی کے پاٹ سے اوجھل رہے وہ گاؤں
ساحل کی اوٹ، جن کا دھواں آشکارا تھا
دنیا کے اس بھنور سے جب ابھرے دُکھوں کے بھید
اِک اِک اتھاہ بھید خود اپنا کنارا تھا

جعفر شیرازی

○

رنگِ حنائے شوق نگاہوں میں آ نہ جائے
جو شام آئی ہے کوئی جادو جگا نہ جائے

وہ رتجگا رہا ہے کہ سوتے ہیں اب چمن
کوئی کہے صبا سے اُدھر کو صبا نہ جائے

ڈھونڈوں کہاں سے تجھ کو صدا دوں کہاں تجھے
بیٹھا ہے تو وہاں جہاں میری ہوا نہ جائے

جائیں نکل کے قریۂ غم سے کہاں کہ اب
وہ جی نڈھال ہے کہ ہنسیں تو ہنسا نہ جائے

آنکھوں میں زخم آ گئے اور دل پہ آبلے
بس اے غمِ حیات اب ہم سے چلا نہ جائے

جعفرؔ جو اپنا حال ہوا سو ہوا مگر
اُس کی گلی سے یوں بھی کوئی بے صدا نہ جائے

شاد امرتسری

○

کسی کلی نے کہا ہے کہ تو رہے بیمار
ملے نہ ڈھونڈے سے بھی تجھ کو تیرے دل کا قرار

میں دردِ دل کا فسانہ کسے کہوں جاکر
نیا نگر ہے، نئے لوگ ہیں، نئے بازار

کبھی تو اُٹھتے ہوئے گرد باد کی صورت
ترا خیال بھی صحرائے دل سے ہو بکنار

تری تلاش میں نکلے تو تیرے دیوانے
جنوں کے جوش میں کھوئے گئے برنگِ بہار

کوئی تو ایسا بھی ہوگا کہ جس نے دل کھو کر
سجایا ہوگا خود اپنی محبتوں کا مزار

میں تیرے اس کرمِ بے کراں سے باز آیا
کہ کھل چکے ہیں مری ذات پر ترے اسرار

میں ایک بندۂ ناچیز ہی سہی پہ شاد
مری خدائی کے قائل ہیں صوفی و مے خوار

بشیر احمد بشیر

○

تیرے سفر کی بھی ابھی آئی نہ تھی گھڑی
سینے میں دل تڑپنے لگا تھا گھڑی گھڑی

کوئی عجب وہ ساعتِ قرب و فراق تھی
وہ تو وہ میں وہ شام کی بجھتی ہوئی گھڑی

عمریں گذر گئی ہیں اِسی دشتِ درد میں
اپنے لئے کہاں کوئی آرام کی گھڑی

چہرے سے اپنے گردِ مہ و سال پونچھتی
دل میں در آئی پھر کوئی یادوں بھری گھڑی

تصویر بن کے رہ گئے قرطاسِ رُوح پر
ہوتے نہ تھے نظر سے جو اوجھل کسی گھڑی

وہ اجنبی دیار جو دریا کے پار ہے
دیکھیں خدا دکھاتا ہے پھر کون سی گھڑی

بات اُس سے کی بشیرؔ نہ کوئی دمِ وداع
جانے وہ کس خیال میں تھا آخری گھڑی

مجید شاہد

○

سینے میں ایک تلخ سا احساس ہے کہ دل
یا رو چراغِ خانۂ افلاس ہے کہ دل

گوہر شناس کوئی نہیں جو پرکھ سکے
یہ مشتِ خاک ریزۂ الماس ہے کہ دل

آٹھوں پہر کوئی مرے پہلو نشیں تو ہے
لیکن وہ ایک ٹوٹی ہوئی آس ہے کہ دل

دونوں ہیں انتظارِ مسلسل کی صورتیں
میں کیا بتاؤں اب مجھے غم راس ہے کہ دل

اتنا تو جانتا ہوں کہ تنہا نہیں مگر
تو ہے کہ اور کوئی مرے پاس ہے کہ دل

اک جنبشِ خفیف میں تحریکِ زندگی
رنگِ رُخِ حیات کا عکاس ہے کہ دل

پھیلے تو ہے سراب، سمٹ جائے تو حباب
شاہدِ ازل کی ٹھہری ہوئی پیاس ہے کہ دل

گوہر ہوشیار پوری

○

کیسی ہوائے شوقِ سخن آج کل چلی
اِک مستیٔ خیال غزل در غزل چلی

بادل کھُلے کہ رہ گئی پھر ڈبڈبا کے آنکھ
موسم بدل چلا کہ طبیعت سنبھل چلی

ڈوبا ہے ماہتاب کہ دل غم سے بجھ گیا
سوچیں بکھر گئی ہیں کہ پھر رات ڈھل چلی

جب سہہ لیا ہے تیری بدلتی نگہ کا زخم
پھر کیا اگر بہار کی رُت بھی بدل چلی

یہ شہرِ اجنبی بھی ترا شہر ہو گیا!
جو شکل بھی ملی ترے پیکر میں ڈھل چلی

یادش بخیر خونِ تماشا کی ساعتیں
اُس بام سے نہ پھر کوئی تیغِ اجل چلی

لوٹی نہ پھر وہ اپنی سخن سازیوں کی شام
پائل کی گت پہ پھر نہ وہ اپنی غزل چلی

تا چند سعیِ ضبطِ فغاں امتحاں کی تاب
یہی تھی خود جو پاؤں میں زنجیر گل چلی

گوہر کہاں وہ اپنی گراں جانیاں کہ اب
پہروں بدن دُکھا جو ہوا ایک پل چلی

انجم اعظمی

○

وہ رشکِ گلرخاں برہم نہیں ہے — مزاجِ شعلہ و شبنم نہیں ہے
مری افسردگی کا ذکر ہی کیا — ترا پہلا سا وہ عالم نہیں ہے
ہر اک لمحہ چمن کا ہے غنیمت — کلی کی زندگی کچھ کم نہیں ہے
سُنا ہے فصلِ گل کے ہاتھ میں بھی — نسیمِ صبح کا پرچم نہیں ہے
یہ پیمانہ ہے زیرِ آگہی کا — مرے ہاتھوں میں جامِ جم نہیں ہے
پئے تدبیر آوارہ ہیں ہم بھی — یہاں تقدیر کا ماتم نہیں ہے
یہاں ہم ہیں غرورِ جاں نوازی — یہاں سب کچھ ہے لیکن غم نہیں ہے
یہ تیرا چاک دامن ہی سہی، کیا — یہ رشکِ دامنِ مریم نہیں ہے
یہ نیرنگِ زمانہ بھی ہے کیا شے — حق و باطل کوئی محکم نہیں ہے
گریباں چاک پھرتی ہے ہوس بھی — ہوس کی تشنگی بھی کم نہیں ہے

چمن ہے سر بہ سر تاراج لیکن
بحالِ گریۂ شبنم نہیں ہے

○

سعادت نظیر

○

حُسن کی جلوہ گری عام ہو، ایسا بھی نہیں
غیرتِ عشق کو یہ بات گوارا بھی نہیں

شدتِ غم میں تری یاد بھی ہے دل سے الگ
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی نہیں

اشک و خوں کی جگہ آنکھوں میں ہے شعلوں کا سماں
یوں ترا غم زدہ رفتا بھی ہے، روتا بھی نہیں

داد کیا دو گے مرے ضبطِ الم کی، سچ ہے
کوئی دن میری طرح تم نے گزارا بھی نہیں

عالمِ درد کسے کہتے ہیں، تم کیا جانو؟
تم نے محسوس کیا ہو کبھی، ایسا بھی نہیں

یاس و حرماں کی وہ ظلمت ہے شبِ ہجر کہ بس!
جھلملاتا کوئی امید کا تارا بھی نہیں

حادثہ ہی مری اُلفت کا کچھ ایسا ہے، نظیر
جس کو دنیا نے سُنا بھی نہیں، دیکھا بھی نہیں

نیاز بدایونی

○

ہر جفا پر مجھے دھوکا ہے وفا ہو جیسے
اب اجازت ہے تمہیں تم مجھے چاہو جیسے

ایک اندازِ بیاں ہے مری خاموشی بھی
اس طرح چپ ہوں کہ کچھ میں نے کہا ہو جیسے

لوگ یوں چھیڑتے ہیں تذکرۂ دار و رسن
کوئی معیارِ جنوں ہی نہ رہا ہو جیسے

تم نے اس طرح چھڑایا ہے کچھ اپنا دامن
ساری دنیا نے مجھے چھوڑ دیا ہو جیسے

یوں تبسم پہ ہر اِک گُل کو سزا ملتی ہے
ایک لمحہ کا تبسم بھی خطا ہو جیسے

دیکھ کر ڈوبتے تاروں کا سماں آخرِ شب
یہ گماں ہوتا ہے دل ڈوب رہا ہو جیسے

دو نگاہوں کا تصادم بھی گوارا ہے نیازؔ
لیکن اس طرح کہ پیمانِ وفا ہو جیسے

○

پڑھنے والوں کے خطوط

غلام الثقلین نقوی

آپ نے افکار و مسائل میں جس مسئلے پر لکھا ہے۔ وہ مدت سے اس امر کا متقاضی تھا کہ اس پر اظہار خیال کیا جائے۔ ادب کی توسیع و اشاعت بذاتہٖ مستحسن ہے لیکن ایک غیر ملک کے ادب کا رطب و یابس سمیت دوسرے ملک کی زبان میں منتقل ہونا بے انتہا ضرر رساں بھی ہے۔ اس سے نہ صرف اپنی تخلیقی رو رُکتی ہے۔ بلکہ ایک مُلک کے اپنے نظریۂ حیات میں بھی خلل پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ چیز قومی غیرت کے منافی ہے۔ دوسری زبان میں صرف وہی ادب منتقل ہونا چاہیئے جس کی حیثیت آفاقی اور بین الاقوامی ہو تاکہ انسانیت کی اعلےٰ اقدار جو پا سکیں اور ایسے شاہکار معدودے چند ہوتے ہیں۔ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں پچھلی ایک صدی میں بڑا اونچا ادب تخلیق ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک اُس میں سے بہت کم حصّہ اُردو میں منتقل ہوا ہے۔ پرل ایس بک، ارنسٹ ہمنگوے، جان سٹین بیک یوجین اونیل اور تھارنٹن وائلڈر قبیل کے ادیب ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آئے۔ ممکن ہے ان کی کتابوں کا ترجمہ مشکل ہو۔

ہمارے ناشرین کرام کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرانے کی کوشش ہونی چاہیئے کہ نئے لکھنے والوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا سرمایۂ تخلیق چند رسالوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور ابھی تک کسی ادارے یا پبلشر نے اتنی توجہ نہیں کی کہ انہیں کتابی صورت میں جمع کر دیا جائے۔ جو لوگ لکھ رہے ہیں۔ وہ حوصلہ افزائی کے فقدان کے باوجود لکھتے رہیں گے "برا بھلا جو کچھ بھی بن پڑا، ادب کے سرمائے میں اضافہ ہوتا ہی رہے گا"۔ لیکن تا کجے۔ ایک اداریہ اس مسئلے پر بھی لکھا جائے تو آپ کا احسان ہوگا۔ یہ بھی آپ کی توجہ کا مستحق ہے

○

مسعود مفتی

اس ماہ کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔ پڑھا۔ دو چیزوں نے خصوصیت سے متاثر کیا۔ ان میں سے ایک تو چونکہ ایسی چیز تھی جس کا رائے عامہ سے تعلق تھا۔ اور ایسی چیز کے بارے میں صحیح طریق کار یہی ہے کہ اگر ایک شخص جرأت سے کام لے کر کچھ بات کہے تو باقی لوگ۔ جو خود یہ بات کسی وجہ سے کہہ نہیں سکے۔ یا کہہ نہیں سکتے۔ وہ اپنی تائید کا اظہار کریں تاکہ کہنے والا اپنی آواز میں دوسروں کی گونج بھی شامل کر سکے۔ میرا مطلب آپ کے دو اداریوں سے ہے۔ ویسے تو ہمیشہ ہی ادبِ لطیف کے اداریے میرے لئے دلچسپی کا سامان ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دو خصوصیت سے متاثر کرنے والے تھے۔ آپ نے ہر پہلو کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ اور اس تجزیے کے بعد قومی شعور والے افراد یقیناً آپ سے اختلاف نہیں کر سکتے۔

آپ کے اداریے اُس حصے سے البتہ متفق نہیں ہوں جس میں آپ نے یونس جاوید کے افسانے کی کمزوری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ دوسری چیز تھی جس نے مجھے خط لکھنے کے لئے اکسایا۔ دراصل یہ میری کمزوری سی بن گئی ہے۔ کسی اچھے لکھنے والے کو جب حسن و عشق کے فرسودہ موضوع سے ہٹ کر ایک کامیاب چیز لکھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو بے پناہ مسرت ہوتی ہے۔ ﷺ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ اور شاید اُن میں سب سے بڑا دکھ مذہب کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جو اصل مذہب کا بھی خاتمہ کرتی ہے۔ اور انسان کا بھی۔ یونس جاوید نے انسان اور مذہب کے باہمی رشتے کا انسان کی ذہنی اور جسمانی کیفیات کے مطابق بدلنے کے متعلق جو خوبصورت افسانہ لکھا ہے۔ وہ غالباً ہر ایمان والے کے کچھ محوں کی آپ بیتی ہیں : ہینگا مشتی کی مکمل داستان ہے۔ میری طرف سے یونس جاوید کو مبارک باد دے دیں۔

○

پروفیسر نظیر صدیقی

پچھلے دو مہینوں کے پرچوں میں آپ نے امریکی مطبوعات کے متعلق جو سوال اٹھایا ہے وہ بہت ہی بروقت بھی ہے اور اہم بھی۔ میں اس معاملے میں اپنے آپ کو قطعاً آپ کا ہم نوا پاتا ہوں۔ امریکی ادب کے تراجم کے مخالف نہ آپ ہیں نہ میں۔ لیکن آپ کی طرح میرا بھی یہ خیال رہا ہے کہ جب ترجمہ ہونا ہی ہے تو پہلے بہترین چیزوں کا ترجمہ کیوں نہ ہو۔ میری تو بڑی آرزو رہی ہے کہ بیسویں صدی کے بہترین امریکی ناول نگاروں، ڈراما نگاروں، افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں کی بہترین تخلیقات اُردو میں منتقل ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ امریکی ادب کے جو ترجمے ہو رہے ہیں ان میں سے بعض قابلِ قدر ہیں لیکن بیشتر ترجمے امریکی ادب کے بہترین حصے کے ترجمے نہیں۔ ترجمے کی افادیت مسلم لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ترجمے کی کثرت ہمارے یہاں کی تخلیقی رو میں رکاوٹ بھی ثابت ہو رہی ہے۔ پھر ترجمے کی ایک کتاب کا دس دس ہزار یا پندرہ پندرہ ہزار کی تعداد میں شائع ہونا بھی کئی لحاظ سے ہمارے ادب کے حق میں مضر ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب امریکی ادارے امریکی کتابوں کے ترجمے شائع کروا رہے ہیں تو وہ امریکی ادب کے بہترین حصوں کا ترجمہ کیوں نہیں کرواتے۔ اس معاملے میں ساری ذمہ داری یقیناً امریکی اداروں کی نہیں ہے۔ ہمارے ادیبوں اور مترجموں کو بھی چاہئے کہ وہ اس غلط صورت حال کی اصلاح کے لئے کچھ کریں۔ پیسہ ہم سب لوگوں کی ضرورت بھی ہے اور کمزوری بھی لیکن جو ادیب پیسے کی خاطر اپنے ادب، اپنی تہذیب اور اپنے وطن کے تقاضوں کو یک قلم نظر انداز کر سکتا ہے اسے چاہئے کہ وہ شعر و ادب کو خدا حافظ کہہ کر کوئی کاروبار کرے یا کوئی ایسی ملازمت جس میں غیبی آمدنی کے امکانات وسیع ہوں۔

○

سید شفیع الحسن رضوی

جولائی کے شمارے میں آپ کا اداریہ نظر سے گذرا۔ آپ نے جن خدشات کی نشان دہی فرمائی ہے وہ سب بجا و درست ہیں اگر غیر ملکی کتابوں کے ترجمے اسی رفتار سے ہوتے رہے تو ہمارے ادیبوں پر ناخوشگوار اثرات پڑنا لازمی ہیں۔ ہمارے بیشتر ادیب، پبلشرز اور قارئین کی عدم توجہی اور بدمذاقی کے باعث پہلے ہی کون سے مرفہ الحالی میں مزید یہ کہ بازار میں غیر ملکی سرمایہ کی مدد سے ... اور آ جائیں گی تو ان کے لئے ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔ میں آپ کی اس رائے سے بالکل اتفاق کرتا ہوں کہ اس طرح ہمارے ... کے

ادیبوں کی فکری صلاحیتوں پر جمود طاری ہوتا جا رہا ہے اور ان کی تخلیق قوتیں تقلید پذیر ہیں۔

مغربی ممالک کی برتری کا احساس ہمارے اذہان پر صرف ان کی دولت اور مصنوعات ہی کی وجہ سے طاری نہیں ہے بلکہ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے بھی ہے جو وہ اپنے افکار اور نظریات کا اپنے ادیبوں کے ذریعے کرواتے ہیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے ادیبوں کے ترجمے سستے داموں مہیا کر کے ان کو عوام میں قبولِ عام کا درجہ دلواتے ہیں کوئی کتاب کتنی ہی خالص ادبی کیوں نہ ہو وہ سیاسی اثرات ضرور مرتب کرتی ہے۔ اس ملک کے نظریات بغیر کسی مخالفت کے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ احساسِ مخالفت اجاگر کئے بغیر دوسرے ملکوں میں پھیلتے جاتے ہیں اور قاری ان کی تہذیب و معاشرت سے مانوس ہوتا جاتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ اس حد تک مانوس اور پھر عادی ہو جاتا ہے کہ اپنی معاشرت اور اپنی اخلاقی قدروں سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر میں محرمات کی حرمت باقی نہیں رہتی۔ اور ممنوعات ناجائز پابندیاں بن جاتی ہیں۔ اس طرح یہ ترجمے ہمیں صرف مغربی ادب اور علوم و فنون ہی سے روشناس نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ ہمیں مغربیت سے قریب تر لا رہے ہیں اور مغربی نظریات کی تبلیغ کر رہے ہیں یہ ہمیں آہستہ آہستہ مغربی نظریات اور مغربی اخلاقی قدروں سے مانوس کر رہے ہیں ان ہی مقاصد کے حصول کے لئے یہ ترجمے سستے داموں مہیا کئے جا رہے ہیں۔ دوستی میں تو کچھ لے اور کچھ دے کا اصول ہوتا ہے آخر یہ "یک طرفہ ٹریفک" کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا ہماری ان ہزاروں اور لاکھوں ادبی، علمی اور غیر سیاسی کتابوں میں کوئی بھی ایسی کتاب نہیں ہے جس کا ترجمہ غیر ممالک کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ جہاں ان تراجم کے ذریعہ غیر ملکی تہذیب و تمدن کو ہمارے عوام میں مقبول کروانے کی سعی بیجا فرمائی جا رہی ہے وہاں ہماری تہذیب سے غیر ملکوں کو کیوں نابلد رکھا جا رہا ہے، دوست ملکوں کے مابین اگر عوام کے وفود کی آمد و رفت نفع بخش ہو سکتی ہے تو اس سے کہیں زیادہ ادبی سرمایوں کے تراجم فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ چنانچہ جس افادیت کا ڈھنڈورا پیٹ کر غیر ملکی تراجم بلائے بے درماں کی طرح ہمارے اذہان پر مسلط کئے جا رہے ہیں وہی افادیت ہمارے تراجم کے لئے بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ ان غیر ملکی تراجم پر غیر ملکی سرمایہ کے ساتھ ساتھ ہمارا ملکی سرمایہ بھی صرف ہوتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہماری کتابوں کے تراجم پر وہ ممالک اپنا سرمایہ نہ صرف کریں۔ مانا کہ یہ ذمہ داری بہت حد تک گلا کی ہے مگر اس کارِ خیر سے یہ کیسے کیوں پرہیز کریں؟

اگست کے شمارے میں یونس جاوید کا افسانہ "رات کی اونچی فصیل" اپنے تاثر کے لحاظ سے ایک اچھا افسانہ ہے۔ راجہ مہدی علی خاں کی نظم "پنجاب کے دیہات میں اردو" اگر ادبِ لطیف کے صفحات کے بجائے کسی درجہ دوم کے پرچہ کی زینت ہوتی تو بہتر تھا

○

پروفیسر ارشد کاکوی

یہ آپ نے خوب کہا کہ ذوق اور ناسخ چونکہ خاصے بدنام شاعر ہیں اور ان کی شاعری "ذہنی ورزش" سمجھی جاتی رہی ہے لہذا بڑی عمدہ بات ہے اگر اس کے علاوہ ان کے بارے میں کوئی بات کی جائے۔ ہمارے تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے ثواب جوڑنے کا ایک ذریعہ ادب کو بھی بنایا ہے اور ایشیائی تہذیب نیز مشرقی رکھ رکھاؤ نے اردو شاعری کو بدنام کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اگر ذوق اور ناسخ صحیح معنوں میں شاعر ہیں۔ تو بتایئے کہ اردو میں شاعروں کی تعداد کیا ہے؟ اردو میں بیہودہ شاعری کی جو گنجائشیں ہیں وہ ہماری لطافتِ طبع پر بدنما داغ ہیں۔ میں اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ ذوق اور ناسخ کے بارے میں اب کوئی کتنی ہی موشگافی کرے، یہ مُردے اب زندہ نہیں ہونے کے۔

مکتبۂ فرینکلن کی ڈھیروں کتابیں بیشک ہماری زبان میں اضافہ نہیں لیکن ہوتا تو یہ چاہیئے تاکہ ہمارے اپنے ادارے اور مصنفین اچھی اور سستی کتابیں چھاپیں اور چھپوائیں۔ دوسروں پر کیا زور؟ "ہم ایسا کیوں نہ کریں" کی جگہ "وہ ایسا کیوں کریں" کی تھیوری جو آپ نے پیش کی ہے وہ کچھ نہیں کچھ ——— اُن کے پاس پیسہ ہے وہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک، اپنے نظریات کی ترویج و اشاعت کرتے ہیں۔ تو کریں اُنھیں تو ہمارے ملک میں عیسائیت پھیلانے کی بھی اجازت ہے۔ جب وہ اپنے مذہب کی ترویج کرتے آئے ہیں تو ادب کی کیوں نہ کریں؟

○

جاوید احسن

جولائی اور اگست کے شماروں میں امریکی ادب کے تراجم کے بارے میں آپ کے خیالات پڑھے۔ میں سو فیصدی ان خیالات سے متفق ہوں۔ اگر یہی مسئلہ ایک سال[1] پیشتر قارئین، گلڈ، اور حکومت کے سامنے لایا ہوتا تو یقیناً اس کے حل کی کوئی صورت نکل آتی ہوتی۔ بہرحال دیر آید درست آید۔ پروفیسر انصاری صاحب نے فرمایا ہے کہ مذکورہ ادارے مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ ہمیں مغربی ادب اور علوم و فنون سے متعارف کر رہے ہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو ہمیں اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی۔ معاملہ بالکل اس کے الٹ ہے۔ سستی قسم کی ہلکی پھلکی کتابوں کے تراجم شائع کرکے ایک طرف تو نئے فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف عام قارئین کو غلط قسم کا ادب پڑھا کر اُن کے اذہان کو متاثر کیا جا رہا ہے۔ بقول آپ کے اگر امریکی ادارے یوجین اونیل، ہاورڈ فاسٹ، آرتھر اور مارک ٹوین کی تخلیقات کو اُردو میں منتقل کرتے تو بات بنتی تھی۔ اور ہم سمجھتے کہ اردو ادب غیر ممالک کے ادب سے مالامال ہو رہا ہے۔ اور ہمیں بین الاقوامی ادبی ورثہ سے اپنا حصہ مل رہا ہے۔

○

سید مراتب اختر

جس جرأت مندی سے آپ نے پچھلے دو شماروں کا اداریہ لکھا ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔

امریکی کتب کے سستے تراجم ہمارے لئے ہر طرح مہلک ہیں۔ اس سے ہمارے تخلیقی ادب کو بُری طرح مجروح ہونے کا اندیشہ ہے۔ تمام بڑے ادیب تخلیقی کام چھوڑ کر ترجموں کے کام میں مصروف ہیں۔ وہ اپنی ضروریات سے مجبور ہیں اور امریکی اداروں کے وارے نیارے ہو رہے ہیں۔

ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب کو معمولی قیمت پر فروخت کرنے کے پس منظر سے کون آگاہ نہیں؟ جب امریکہ ایک کثیر رقم خرچ کرکے تراجم کرواتا ہے۔ اور اُسے مفت تقسیم کر دیتا ہے تو اس کی پالیسی واضح صورت اختیار کر جاتی ہے۔ مخصوص نظریات کے پراپیگنڈے کے لئے سالہا سال تک تراجم ہوتے رہیں تو ہمارے ادب کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ یہ بات آپ نے بروقت سوچی ہے۔

جن کتابوں کے دھڑا دھڑ تراجم ہو رہے ہیں۔ اُن سے امریکہ کو یقیناً فائدہ ہوگا۔ مگر سوچنا یہ ہے کہ ہمیں ان سے کیا فائدہ پہنچے گا آخر ہمیں امریکہ کے بہترین ادب سے محروم کرکے پراپیگنڈہ ادب سے کیوں نوازا جا رہا ہے؟ ہمیں اس اہم ادبی مسئلہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

○

---

[1] یہ مسئلہ اس مدت سے پہلے اٹھایا گیا تھا۔ (مرتب)

ممتاز احمد کرمانی

"ادبِ لطیف" کا میں بہت پرانا خریدار ہوں اور ہمیشہ نہایت دلچسپی سے جملہ مضامین کا مطالعہ کرتا ہوں
ماہ جولائی ۱۹۷۰ء کا ادبِ لطیف زیرِ مطالعہ ہے۔ اداریہ قابلِ صد تحسین ہے۔ کہ ادب کے ناسور کی طرف آپ نے قارئین اور اربابِ بست و کشاد کی توجہ دلائی ہے۔ ہمارے ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ وہ بے ذوق یارانِ طریقت کے ہاتھوں بُری طرح مسلا جا رہا ہے موجودہ اداریہ ان احباب کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس طرف آمادہ ہوں خدا انہیں نگاہِ بصیرت سے سرفراز کرے۔
خالدہ اصغر کا افسانہ اندھیروں کی آگ، انگریزی الفاظ سے بھرپور ہے، جو اردو ادب کی نازک اور لطیف روح کیلئے خارِ بے ادبی سے کم نہیں ہے۔ اے کاش! ایسے ادیب اردو ادب کی روح کو ایسے روح فرسا طوار سے محفوظ رکھیں۔ تو کیا ہی اچھا ہو۔ ترجمہ شدہ افسانے بھولی بھالی لڑکی، اور گھر والا، دیگر افسانوں سے بدرجہا معیاری ہیں۔ غلام الثقلین نقوی اور ظہیر کاشمیری نے اپنے افسانوں میں نسوانیت کے انہماک میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لی ہے۔

○

نگہت انجم

"ادبِ لطیف" کے گذشتہ اور موجودہ شمارے میں افکار و مسائل کے زیرِ عنوان آپ نے بے باکی اور جرأت سے کام لیتے ہوئے سستے امریکی پراپگنڈہ کی۔ جسے ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ جس خوبصورت انداز سے قلعی کھولی ہے اس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ہر وہ انسان جسے ادب سے ذرا بھی لگاؤ ہے وہ اس رجحان کو دیکھ کر مستقبل کے بارہ میں خطرات محسوس کر رہا ہے۔ اگر امریکی پراپگنڈہ کے تراجم کا یہی سلسلہ جاری رہا تو اس سے عوام کے اندر یقیناً تنگ نظری پیدا ہوگی اس سے قطع نظر اس ملک کے تخلیقی سوتے خشک ہو جائیں گے۔ مانا کہ "فرینکلین" والے کافی سے زیادہ رقم بطور معاوضہ دیتے ہیں۔ اور یہ اس کا نتیجہ ہے کہ بڑے بڑے ادیب بھی اپنی صلاحیتوں کو فرینکلین کے ہاتھوں فروخت کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس سے ادب پسند عوام کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ مترجم نے ہزاروں بنا لئے۔ ناشر نے ہزاروں کما لئے۔ لیکن ان کتابوں کے خوبصورت گٹ اپ سے متاثر ہو کر جو لوگ اس معاشی بدحالی کے دور میں کتاب خریدتے ہیں۔ ان کے پلے کیا پڑتا ہے! میں نے خود جا کر ایسی کتابیں خریدیں اور ہر کتاب میں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر انکل سام کی شان میں قصیدے دیکھے تو آئندہ کے لئے توبہ کی۔

○

جائزے

پچھلے دنوں ادبِ لطیف کے دفتر میں تبصرے کی غرض سے جو کتابیں پہنچی ہیں، وہ کافی اہم ہیں۔ اپنے مخصوص موضوعات کے اعتبار سے بھی اور اس پہلو سے بھی کہ ان کا اندازِ پیشکش بھی روایتی نہیں ہے۔ بلکہ اس باب میں بھی تجربے کئے گئے ہیں۔ اس وقت کہ بیشتر اردو ناشرین اپنی بعض سرگرمیوں سے اردو ادب کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ ان کتابوں کی موجودگی ہمارے تخلیقی ذہن کی قابلِ قدر صلاحیتوں کا ثبوت دے کہ ہماری مایوسی کی کس قدر ہانی کر رہی ہے۔ ان کتابوں میں ہماری نظر سب سے پہلے جس کتاب پر پڑتی ہے۔ وہ ایک مجموعۂ کلام ہے۔ ایک ایسے شاعر کا جو اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اور جس کا یہ مجموعۂ کلام ہی تنہا یادگار ہے۔ مجموعے کا نام **مَوجِ خُون** اور اس کے مصنف مرحوم محمد ریاض ہیں۔ اس مجموعے کی نظمیں پڑھ کر اولین تاثر جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم نے ایک عقیدے، ایک نصب العین اور ایک واضح، غیر مبہم اور جاندار اصول کی خاطر شاعری کی تھی۔ انہوں نے اپنے سینے کی گہرائیوں میں اس آتشیں شعلے کی حرارت محسوس کی تھی، جو دکھی انسانوں کو دیکھ کر بے اختیار بھڑک اٹھتا ہے۔ اور اپنے خارجی اظہار کے لئے شاعر کو بے تاب کر دیتا ہے۔ احمد ریاض نے بڑی ذہانت، خلوص اور ایک بے پایاں لگن کے ساتھ اپنے اندرونی درد و کرب کو الفاظ میں منتقل کیا ہے۔ مگر ان کا لہجہ کسی منطیب کا لہجہ نہیں ہے۔ ایک فنکار کا لہجہ ہے۔ ایک ایسے شخص کا لہجہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں شدتِ احساس کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں وہ چیز بھی ہوتی ہے۔ جسے فن کارانہ نفاست کہا جاتا ہے۔ کہیں کہیں شاعر نے اس نفاست کا پورا پورا خیال نہیں کیا۔ لیکن اس کی بھی ایک بنیادی وجہ ہے۔ ہجومِ فکر سے جب دل مثلِ موج لرزتا ہے تو یہ لرزش کبھی کبھی لغزشِ مستانہ بھی بن جاتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے موجِ خون کا مصنف ایک باشعور اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنے والا شاعر ہے۔ اس کے یہاں فکر و فن کا بڑا اچھا اور صاف ستھرا امتزاج ملتا ہے۔

کلام کے شروع میں، احمد ندیم قاسمی کا ایک مختصر مگر جامع دیباچہ ہے، اور آخر میں اختتامیہ کے عنوان سے پروفیسر شوؔ۔ نے مرحوم کی شاعری کے نمایاں خد و خال کی نشان دہی کی ہے —— خوبصورت اور موثر پیرائے میں۔

موجِ خون کی ضخامت دو سو تیس صفحات ہے۔ کتابت و طباعت گوارا۔ قیمت پانچ روپے ناشر: مجلس یادگار ریاض کچہری بازار لائل پور۔ م۔ ل

مولانا شبلی کی تقلید میں

مولانا شبلی نے فارسی شعراء کا ایک ضخیم تذکرہ لکھا تھا۔ شعرالعجم کے نام سے۔ یہ اہم تذکرہ فارسی شاعری کی ابتداء سے لے کر ان شعراء تک پھیلا ہوا ہے۔ جو شاہ جہاں کے دور تک زندہ تھے۔ اور کلیم ہمدانی کے بارے میں یہ لکھ کر کہ "وہ صحیفۂ شاعری کا آخری ورق تھا"۔ بات ہی ختم کر دی ہے۔ حالانکہ اس عہد کے بعد اس برصغیر میں جو فارسی گو شاعر پیدا ہوئے۔ انہوں نے فارسی شاعری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے اور واقعہ ان کی شاعری شعری محاسن کے اعتبار سے ایرانی شاعروں کے مقابلے میں ہرگز کم تر نہیں ہے۔ فارسی شعراء کا ذکر کرتے وقت بھلا کون ذہن دار نقادیں بیدلؔ، ناصر علی سرہندی، غنیمتؔ، مظہر جانِ جاناںؔ، غالبؔ، گرامیؔ اور

اقبال کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ یہ شاعر سب کے سب اسی خاک سے اٹھے تھے۔ اور جو شاعر ایران سے آئے تھے۔ ان کی شاعری بھی یہیں آکر چمکی تھی۔

مدت سے اس چیز کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی صاحب ان شعراء کا مبسوط تذکرہ مرتب کر دیں۔ اور یہ ضرورت آج شیخ اکرام الحق نے پوری کر دی ہے۔

اس تذکرے سے پیشتر شیخ اکرام کا بھی اسی نوعیت کا ایک تذکرہ موجود ہے۔ جو غالباً اس وقت منظرِ عام پر آیا تھا۔ جب شہنشاہِ ایران یہاں تشریف لائے تھے۔ مگر یہ تذکرہ — تذکرے کی بجائے یہاں کے فارسی شعراء کے کلام کا مختصر سا انتخاب ہے — اس لئے ہماری بنیادی ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہے — زیرِ نظر تذکرہ — شعر العجم فی الہند، قریب قریب وہ تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔ جن کی توقع تحقیق و تنقید کی کسی جامع کتاب سے کی جا سکتی ہے۔ اور کی جانی چاہیئے۔

شیخ اکرام الحق جنہوں نے اواخر عہدِ شاہجہاں سے اساس پاکستان تک — کے چیدہ چیدہ فارسی شاعروں کے حالاتِ زندگی اور کلام کو موضوع بنایا ہے۔ فارسی شاعری کے بڑے اچھے اور اعلیٰ پائے کے مورخ، مفسر اور نقاد ہیں۔ تصنیف و تالیف میں ان کا نام ہمارے سامنے پہلی مرتبہ ہی آیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات ہرگز ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ کوئی نئے لکھنے والے ہیں۔ ان کے اندازِ فکر اور اندازِ تحریر میں اس پختہ کارانہ فنی بصیرت کا احساس ہوتا ہے جو برسہا برس کی شدید ریاضت کا نتیجہ ہوتی ہے — اس کتاب کا خیر مقدم کرکے ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے۔

یہ تذکرہ — شعر العجم فی الہند — اچھی خاص کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ کلاں سائز چار سو اسی صفحات۔ قیمت بارہ روپے۔ پچاس پیسے
ناشر۔ شعبہ اشاعت اکرام — نشتر روڈ ملتان

(م - ل)

انجمن ترقی اردو کی تین کتابیں

انجمن ترقی اردو نے ایک وسیع اشاعتی پروگرام مرتب کیا ہے۔ جس کے سلسلے کی پہلی تین کتابیں چھپ کر بازار میں آگئی ہیں۔ ان تین کتابوں میں پہلی کتاب کا نام ہے نصرتی — جو ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات اور کلام پر محققانہ تبصرہ ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے قلم سے۔ نصرتی کی زبان اس دور کی زبان ہے جب اردو نے گھٹنوں کے بل چلنا شروع کیا تھا۔ موجودہ دور میں یہ زبان بڑی غیر مانوس معلوم ہوگی۔ مگر نصرتی بہرصورت ایک اہم شاعر ہے۔ اس لئے اس کا تذکرہ بہت ضروری ہے۔ اور اس کٹھن ذمے داری سے صرف مولوی عبدالحق ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اور انہوں نے ہی یہ فرض ادا کیا ہے۔ مولوی صاحب نے ایسے زاویہ نگاہ سے شاعر کے کلام کا تجزیہ کیا ہے کہ اس کی پوری شخصیت ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ نہ صرف اس کی شخصیت بلکہ اس کے دور کی امتیازی خصوصیات بھی۔ نصرتی کی زبان بڑی غیر مانوس ہے۔ اور یہ دقت مولوی صاحب نے اس طرح دور کر دی ہے کہ ہر شعر کے ساتھ اس کا مطلب بھی لکھ دیا ہے علاوہ ازیں آخر میں فرہنگ بھی دے دیا ہے۔

نصرتی — تین سو اڑتالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت پانچ روپے۔ ناشر: انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔

جیتا جاگتا — انجمن کی دوسری کتاب ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات ۱۶۲۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

جیتا جاگتا — ابن طفیل کی عربی تصنیف حی بن یقظان کا اردو ترجمہ ہے۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر سید محمد یوسف نے کیا ہے۔ اور کتاب کے ساتھ ایک تبصرہ بھی ہے۔ جس میں کتاب کی نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جیتا جاگتا ۔۔۔ بظاہر ایک قصہ کہانی ہے ۔۔۔ ایک بچہ ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچ جاتا ہے ۔ وہاں ایک ہرنی کا دودھ پی کر پرورش پاتا ہے ۔ اور جب اس کا شعور بیدار ہوتا ہے تو اپنے اِردگرد جانوروں ، جزیرے کی سنسان زمین اور پرندوں کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھتا ۔۔۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک سوال ابھرتا ہے ، کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے ۔۔۔ یہ سوال اسے زندگی کی گہری حقیقتوں کی طرف لے جاتا ہے ۔ اور وہ اپنے غور و فکر سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے ۔ اور یہ نتائج وہی ہیں جو علم کی روشنی کے ساتھ طلوع ہوتے ہیں ۔

یہ کتاب دنیا کی کئی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے ۔۔۔ اردو میں پہلی مرتبہ چھپی ہے ۔ ترجمہ اصل کے مطابق ہے ۔ کتاب فلسفیانہ مباحث لئے ہوئے ہے ۔ اس لئے ترجمہ ذرا ادق ہے ۔ اور یہ ایک مجبوری ہے ۔

تیسری کتاب ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تصنیف داستانِ زبانِ اردو ہے ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس سے پیشتر اردو زبان کا ارتقا کے نام سے ایک مبسوط مقالہ بھی دے چکے ہیں ۔ اس مقالے میں اردو زبان کی نشو و نما کے بارے میں اپنے تحقیقی نتائج قلم بند کئے ہیں ۔ اور زیر نظر کتاب میں انہوں نے ان منزلوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے ۔ جن سے ہماری زبان وقتاً فوقتاً گزرتی رہی ہے ۔ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے ۔ اور ہر باب اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑا اہم ہے ۔ ڈاکٹر صاحب اردو کے مزاج و منہاج ، صرفی و نحوی مسائل اور تمام مدارجِ ارتقا سے بہت اچھی طرح واقف ہیں ۔ اور انہوں نے بحث کے ہر پہلو سے پورا پورا انصاف کیا ہے ۔

کتابت و طباعت خوشگوار ۔ قیمت پانچ روپے ۔ (م ۔ ل)

ہماری عادتیں ۔۔۔ ہمارے جذبات

اردو میں آج کل ایسی کتابیں تیزی سے آرہی ہیں ۔ جن کے ذریعے براہِ راست زندگی کے بنیادی مسایل کا نفسیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ مصنف گیانندر رماہی ، جو اس سے پہلے بھی اس قسم کی کتابیں لکھ چکے ہیں ۔ مترجم بسنت کمار چیٹرجی اور دھا شنکر بھاردواج ہیں ۔

مصنف کا مطالعہ اور مشاہدہ ۔۔۔ دونوں گہرے ہیں ۔ اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ۔ سوچ سمجھ کے لکھا ہے ۔

صفحات ۱۲۸ ۔ قیمت ڈھائی روپے ۔ ناشرین ۔ پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں ۔ دہلی (م ۔ ل)

منظوم ڈرامے

عبدالعزیز خالدؔ کے موضوعاتِ فکر اردو کے قریب قریب تمام شعرا سے مختلف ہیں ۔ وہ یونانِ قدیم کی اساطیر و روایات سے بالخصوص متاثر ہیں ۔ اور انہی روایات کو اپنا فکری رنگ و روغن دیتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ اس سے پیشتر وہ یونانی شاعرہ سیفو کے نغمے اردو میں پیش کر چکے ہیں ۔ یہ کتاب ان کے منظوم ڈراموں کا مجموعہ ہے ۔ نام ہے " دکانِ شیشہ گر " ۔۔۔ ان ڈراموں کے واقعات بھی اساطیر و روایات سے لئے گئے ہیں ۔ مگر خالد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے واقعاتی ماحول کو اس کی تمام نزاکتوں کے ساتھ اپنی تخلیقات میں منتقل کر دیا ہے ۔ خالدؔ کو اردو کے علاوہ عربی اور فارسی پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے ۔ انہوں نے اپنا مفہوم واضح کرنے کے لئے تینوں زبانوں سے مدد لی ہے ۔ عربی کی طرف ان کا ذہن خاص طور پر جھکا رہتا ہے ۔

" دکانِ شیشہ گر " کے مصنف کی کوشش خاص خاص حلقوں ہی میں مستحسن سمجھی جائے گی ۔ اور اس کا انہیں بھی احساس ہوگا ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے مخصوص اندازِ فکر سے ہماری زبان کا دامن وسیع کر رہے ہیں ۔ اور اسے اظہار و ابلاغ کے نئے ذریعے دے رہے ہیں ۔ یہ کام جو خالد کر رہے ہیں ۔۔۔ بڑی جان کاہی کا تقاضا کرتا ہے ۔ اور یہ جانکاہی اس وقت کچھ بڑھ ہی جاتی ہے ۔ جب یہ حقیقت بھی ذہن میں رہتی ہے ۔ کہ یہ کوشش اس درجے کی مقبولیت میں حاصل نہیں کر سکے گی ۔ مصنف کا حوصلہ قابلِ داد ہے ۔

گٹ اپ نہایت عمدہ۔ صفحات ۲۰۰ بیس۔ قیمت تین روپے۔ ناشر اپک لینڈ، محمد بلڈنگ۔ بندر روڈ کراچی (م - ل)

منظور احمد منظور کا مجموعہ کلام

دیدہ بینا، کے نام سے منظور احمد منظور کا مجموعہ کلام چھپ گیا ہے۔ اس مجموعے کو ناشرین، لاہور نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے۔ صفحات ایک سو چوالیس ہیں۔ کتابت و طباعت بہت اچھی۔ قیمت چار روپے۔ ناشرین لاہور سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

منظور احمد منظور۔ اردو کے ان شاعروں کی صف میں شامل ہیں جنہیں نہ تو ستائش کی تمنا ہوتی ہے اور نہ صلے کی پروا۔ منظور صاحب کم و بیش ربع صدی سے بڑی خاموشی کے ساتھ۔ بغیر کسی نام و نمود کی خواہش کے شعر کہہ رہے ہیں۔ اپنے کلام کو انہوں نے شاذ و نادر ہی رسائل و جرائد میں طبع کرایا ہے۔ ان کے یہاں نہ تو ہیئت کا کوئی چونکا دینے والا تجربہ ملے گا۔ اور نہ ان کی تخیل کسی خاص بلندیوں پر پرواز کرتی ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری خاصے کی چیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے جذبے کی شدت کے ساتھ کہا ہے۔ شعروں میں ان قدروں کا بہ دل رجحان احترام کیا ہے۔ جو انسانی زندگی کو حسن، عظمت اور تنظیم بخشتی ہیں۔ انہوں نے انسانیت کی سربلندی کے گیت گائے ہیں۔ اور اسی کو اپنی شاعری کا معراج سمجھا ہے۔

منظور صاحب طبعاً نرم رو ہیں۔ ان کے شعروں میں بھی تیز روی کی بجائے میانہ روی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں بھڑک اٹھنے والی کیفیت ہے بھی۔ تو وہ بڑی جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد پھر وہی نرم روی آجاتی ہے جس کے وہ عادی ہیں۔

دیدہ بینا، منظور صاحب کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ویرۂ حرم کے نام سے کافی مدت ہوئی چھپ چکا ہے (م - ل)

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے

وزیر آغا کے بارے میں ایک بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آغا صاحب انشائیے کی روح کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور ان تمام لطافتوں کو اپنے انشائیے میں لے آتے ہیں جو اس روح سے عبارت ہیں۔ انشائیہ بہت کچھ ہے اور بہت کچھ ہے بھی نہیں۔ اس کے لئے جہاں ایک ہفت پہلو صلاحیت کی ضرورت ہے۔ وہاں اس کا لازمی جزو ایک تربیت یافتہ ذہانت بھی ہے۔ اور آغا صاحب کے یہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ ان کے انشائیوں کا یہ مجموعہ جس کا نام "خیال پارے" ہے۔ اردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ اس مجموعے کے ہر انشائیے میں وہ سب کچھ ہے جو ایک مثالی انشائیے میں ہونا چاہیئے۔ لطافت، ظرافت، بذلہ سنجی، گہرا مشاہدہ، دلائل آفرینی اور ان کے ساتھ ساتھ اپنا ایک مخصوص وجدانی ذوق۔

خیال پارے، دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کتابت و طباعت بہت عمدہ، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ یہ اکادمی پنجاب کا حوصلہ ہے کہ وہ دو سو صفحات کی ایک مجلد کتاب صرف ڈیڑھ روپیہ میں دے رہی ہے۔ اکادمی پنجاب کا پورا پتہ ——— اکادمی پنجاب مال روڈ لاہور۔ (م - ل)

نمونہ لغات اردو

ترقی اردو بورڈ کراچی ایک مدت سے بڑی سرگرمی کے ساتھ اردو کی ایک جامع، مستند اور وقیع لغت کی تعمیر میں مصروف ہے۔ اس لغت کو انگریزی کی اس لغت کے مطابق مدون کیا جا رہا ہے۔ جسے آکسفورڈ یونیورسٹی نے ترتیب دیا تھا۔ اردو بورڈ کے محترم صدر جناب ممتاز حسن نے پیش لفظ میں اس زیر ترتیب لغت کے بارے میں جن قواعد و ضوابط کی وضاحت کی ہے ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت جب مکمل ہو جائے گی۔ تو اردو پڑھنے والوں کی ایک

بہت پیاسی تشنگی بہت جلد رفع کرے گی۔ یہ کارنامہ حقیقتاً ایک بڑا کارنامہ ہے اور اس کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کا علم و فضل ہر شک اور شبے سے بالاتر ہو اور جو ایک لگن ایک جذبے کے ساتھ اپنے متعلقہ فرائض دے سکیں۔ اور یہ خوشی کا مقام ہے کہ اس کام کے لئے اردو ترقی بورڈ کو ایسے ہی لوگ مل گئے ہیں صدر ممتاز حسن ہیں۔ ارکان میں مدیرانِ لغت ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ اور ڈاکٹر شہید اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بورڈ کے سیکرٹری — بلکہ روحِ رواں اردو کے ممتاز شاعر شان الحق حقی ہیں۔ جن کا ولولۂ عمل بہر صورت قابلِ قدر اور قابلِ تحسین ہے۔

یہ نمونہ لغاتِ اردو چھیالیس صفحات کو محیط ہے اور اس میں جزو الف از اب تا اشفاق اور جزو ب از اباحت تا اصیل کے الفاظ شامل ہیں۔ (م۔ ل)

نغمۂ دل

نغمۂ دل رونق جودھپوری کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے جسے مکتبہ اشاعت اردو کوٹری نے شائع کیا ہے۔ رونق کا سلسلۂ تلمذ عبدالباری تنہا، بیدل بدایونی اور احسن مارہروی کے ذریعے داغ دہلوی سے جا ملتا ہے۔ داغ کے شاگردوں نے سوائے علامہ اقبال کے اپنے کلام کو داغ کی کسی ایک خوبی تک ہی محدود کر لیا تھا۔ احسن مارہروی کا کلام بھی اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں۔ مگر رونق تک داغ کی کوئی خوبی نہیں پہنچ سکی۔ علاوہ ازیں ان کے کلام میں کوئی انفرادیت بھی نہیں ملتی۔ البتہ بیشتر اشعار میں سادگی، رعنائی اور پختگی موجود ہے۔ لیکن وہ نشتریت کہیں موجود نہیں جو شعر کی جان ہے۔ بعض جگہ تنافر، حشو و زوائد، تعقید اور بعض دوسری فنی خامیاں بھی کھٹکتی ہیں۔ رونق جودھپوری ابھی نوجوان ہیں۔ اگر وہ مجموعہ شائع کرنے میں عجلت سے کام نہ لیتے تو شاید ان کے لئے بہتر ہوتا۔

نغمۂ دل پاکٹ سائز کے ۹۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور غیر مجلد ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ہے جو زیادہ ہے۔ (خواجہ ذکریا)

اردو غزل ولی تک

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ادبی اور تنقیدی حلقوں میں خاصے معروف ہیں۔ ان کی زیرِ تبصرہ کتاب قدیم اردو غزل کے بارے میں نیم تحقیقی اور نیم انتقادی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں خسرو اور بعض صوفیائے کرام کے ریختوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ دراصل دھندلکوں کا دور ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس پر پوری روشنی نہیں ڈال سکے البتہ دوسرا دور جو قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے شاعروں پر مشتمل ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس دور میں مثنوی کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ مگر غزل کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، شوقی، طبعی، مشتاق، لطفی، ہاشمی، وجہی وغیرہ نے اچھی غزلیں کہی ہیں۔ مصنف نے اس دور کی غزل کی خصوصیات کا بہت اچھی طرح سراغ لگایا ہے، اور جا بجا اشعار کی تشریح کر دی ہے۔

تیسرا دور ولی کی تخلیقات سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ضمناً حاتم، آبرو، مضمون، یکرنگ کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ سراج اورنگ آبادی کا نام کہیں موجود نہیں۔

کتاب کی قیمت تین روپے اور ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی نمبر ۳ ہے۔ (یونس جاوید)